دورانِ مُطالعہ ہزاروں صفحات سے چُنے گئے دلکش
اور دلنشیں علمی، ادبی اور سوانحی اقتباسات پر مشتمل

زرّیں اوراق

محمد فہیم قاسمی گورکھپوری
استاذ جامعہ شیخ الہند انجان شہید، اعظم گڑھ

مرکزِ اشاعت
حکیم الاسلام لائبریری
بیلی پار، گورکھپور، یوپی، انڈیا

دوران مطالعہ ہزاروں صفحات سے چنے گئے دلکش
اور دلنشیں علمی، ادبی اور سوانحی اقتباسات پر مشتمل

زرّیں اوراق

محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری
استاذ جامعہ شیخ الہند انجان شہید اعظم گڈھ

مرکز اشاعت:
حکیم الاسلام لائبریری بیلی پار، گورکھ پور، یوپی، انڈیا

فہرست

انتساب

شریک زندگی کے نام جن کی یادیں اور محبتیں ستاتی رہتی ہیں۔

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

اپنی بچی کے نام جس کی مسکراہٹیں زندگی کے لئے سہارا ہیں۔

مجھ کو بخشی خدا نے اک بیٹی
چاند آنگن میں اک اتر آیا

کتاب معتبر

ابوالمجاہدزاہدؔ نے کہا تھا

لوگ چن لیں جن کی تحریریں حوالوں کے لئے
زندگی کی وہ کتاب معتبر ہو جایئے

یہ اعتبار عملی دنیامیں بھی اور تحریری دنیامیں بھی بہت مشکل سے حاصل ہوتا ہے، زندگی کی کٹھنائیوں، حوادث زمانہ اور اس کی پریشانیوں سے گزرکر ہی انسان تجربات کی وادی میں قدم رنجہ ہوتا ہے، پریشانیاں اٹھائے بغیراور شدائد ومصائب جھیلے بغیر انسان کو تجربہ کارنہیں کہاجاسکتا، اسی لئے ایک عام کہاوت ہے ”سل المجرب ولاتسئل الحکیم ”تجربہ کار سے پوچھو حکیم سے نہیں“ اسی طرح دین کے تعلق سے کلیدی مسائل اور بنیادی معلومات بھی تجربہ کاراہل علم سے معلوم کرنے کا حکم ہے نوآموزاور محض ڈگری یافتہ افرادکواس میدان میں ہمیشہ منہ کی کھاتے دیکھا گیا ہے۔

کتابوں کوروح کی غذا کہا گیا ہے، یہ کتابیں ہمارے لئے کسی مشفق مشیر سے کم نہیں ہیں، یہی کتابیں ہمیں راہ مستقیم دکھاتی اورراہ ہدایت بھاتی ہیں، ان کے ذریعہ انسان کا ذہن ودماغ ہمیشہ تازہ، اس کاعلم شگفتہ اوراس کی بصیرت پختہ رہتی ہے، ان کتابوں کو بہترین ساتھی کہاجاتا ہے، جس قوم کاتعلق کتابوں سے استوار رہتا ہے کامیابی کی منزلیں طے کرتی ہے اور جوقوم اس وراثت سے محروم ہوجاتی ہے ترقیات اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیتی ہیں، کام کا انسان وقت ضائع نہیں کرتا، ناکام انسان ہمیشہ وقت ضائع کرتا ہے، دوستی کے لئے ایسے افرادکاانتخاب کیجئے جوصاحب علم، علم دوست اور کتابوں سے تعلق ومحبت رکھنے والے ہوں؛ کیونکہ وہ آپ کواپنے علم کی برکت اوراس کے نورسے منوررکھنے کی

کوشش کریں گے، جب کہ جاہلوں، امیروں، رئیسوں اور جاگیرداروں سے دوستی ہر دور میں نقصان دہ رہی ہے، انسان کی پہچان اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں سے ہوتی ہے، جس کے پاس رئیسوں، وزیروں اور ساہوکاروں کی آمدورفت زیادہ ہوتی ہو تو سمجھ لیں کہ وہ شخص دولت کی چاہ اور جاہت رکھتا ہے اور جس کے پاس غریب، سادہ اور پسماندہ افراد آتے ہوں تو گواہی دیجئے کہ وہ متواضع اور خاکسار ہے۔

کھیت کی خوبی فصل دینا ہے، درخت کی خوبی پھل دینا ہے، بڑے پن کی علامت سخاوت اور کرم کے خوان کو دراز کرنا ہے اور جہالت کی علامت دوسروں کے لئے اپنے در کو بند رکھنا ہے، وہ علم، علم نہیں جس سے دوسرے فیضیاب نہ ہوں، وہ عالم، عالم نہیں جس سے لوگوں کو فیض نہ پہنچتا ہو، نبیوں کے امام حضرت رسول مقبول علیہ السلام کا ارشاد سراپا رشاد ہے کہ تم میں سب سے بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔

فائدہ پہنچانے کے لئے کوئی ایک راہ متعین نہیں ہے ہر راہ سے آپ فائدہ پہنچا سکتے ہیں چنانچہ:

اگر آپ عالم دین ہیں تو دین کی تعلیم، شریعت کے تقاضوں اور اللہ و رسول اللہ کے ارشادات سے لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔

اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو مریضوں سے شفقت، ہمدردی اور ان کے لئے اپنی فیس میں تخفیف کریں۔

اگر آپ کاشتکار ہیں تو غلہ کو منڈی میں فروخت کرنے کے بجائے رعایت کے ساتھ غریبوں کو فروخت کریں۔

اگر آپ تاجر ہیں تو تجارت کے دوران غریبوں سے ہمدردی اور رعایت کا معاملہ رکھیں۔

اگر آپ سرکاری نوکر اور دفتر کے بابو ہیں تو مظلوموں کے تعاون کے لئے آگے بڑھیں۔

اگر آپ حکمراں ہیں یا آپ کے ماتحت کچھ افراد کام کرتے ہیں تو ان سے انسانیت کا مظاہرہ کریں۔

اگر آپ رکشہ چلاتے ہیں تو آپ کمزوروں، ضعیفوں اور غریبوں کو مقدم رکھیں۔

اگر آپ کسی فیکٹری کے مالک یا کسی کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں تو اپنے نوکروں کی ضروریات کا خیال رکھیں۔

اگر آپ کسی مدرسہ کے استاذ یا کسی مسجد کے پیش امام ہیں تو طلبہ سے شفقت اور مقتدیوں سے محبت کریں۔

اگر آپ کسی ادارہ کے سربراہ یا کسی یونیورسٹی کے ڈین ہیں تو طلبہ اور ملازمین کو ان کا جائز حق دیں۔

الغرض اسلام نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر خیر خواہی اور ہمدردی کرنے کا درس دیا ہے تا کہ نیکی کا ماحول بنے اور معاشرہ کی اصلاح ہو۔

دنیا میں کروڑوں کتابیں موجود ہیں، لاکھوں اہل علم اور ہزاروں تجربہ کار افراد اپنے تجربات سے کروڑوں کو فائدہ پہنچانے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں، اب آپ تھوڑی دیر کے لیے سوچئے! کہ کون سی قوم اور کون سا مذہب سب سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے؟ تو پتہ چلے گا کہ وہ مذہب اسلام ہے، جس کی تعلیمات ہی کچھ اس قسم کی ہیں کہ کوئی بھی اس کی توجہ اور رعایت سے محروم نہیں رہا، ہر طبقہ کے لئے اس کی راہنما تعلیمات موجود ہیں اور کسی نہ کسی درجہ میں مسلمان الحمد للہ انسانی ہمدردی کا عدیم النظیر مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

کتاب لکھنا بھی انسانی ہمدردی کا ایک حصہ ہے؛ کیونکہ کتابوں سے انسان کو روشنی

ملتی ہے، اندھیرے کے بادل چھٹتے ہیں، ہدایت کا نور چمکتا ہے، اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے، شیطانی بہکاوے میں نہیں آتا ہے اور یہی سب سے اہم اور سب سے بڑی بات ہے کہ انسان ہر قسم کے شیطانی حربوں وضربوں سے خود کو بچا کر اللہ کے لئے خود کو فارغ اور یکسو کر لے۔

مولانا محمد فہیم قاسمی گورکھپور (یوپی) کے رہنے والے ہیں، میری ان سے بالمشافہ کوئی ملاقات اب تک نہیں ہوئی ہے تاہم اللہ جزائے خیر عطا فرمائے محترم مولانا عبدالمتین منیری صاحب مدظلہ کو جنھوں نے ۲۶ر دسمبر ۲۰۱۶ء کو سوشل میڈیا پر "علم وکتاب" کے نام سے ایک واٹس اپ گروپ تشکیل دیا جس میں دنیا بھر کے چیدہ اور چنیدہ اہل علم کو شامل کیا گیا، یہ گروپ کچھ ایسی نوعیت اختیار کر گیا کہ مجھ جیسا طالب علم اس کی پوسٹوں کا منتظر رہتا، ہر عالم کی پوسٹ پہلی پوسٹ سے منفرد ہوتی، علم کا پھیلاؤ، معلومات کی ندرت اور علمی دنیا میں سنجیدگی ومتانت کا ایسا قابل رشک مظاہرہ کہ بہت کم کسی نے دیکھا ہوگا، دو سال پہلے مجھے بھی اس گروپ میں شامل کیا گیا تو یہ پتہ چلا کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" مختلف مشارب اور مسالک کے اس پلیٹ فارم پر کوئی بات بھی خلاف ضابطہ نہیں ہوتی، جس کو جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف فرمائش کرے اور ڈھائی سو تجربہ کار علمائے کرام میں سے کوئی نہ کوئی تسلی بخش جواب اور مطلوبہ چیز سے شادکام کر دیتا، سچ کہتا ہوں مجھے اس گروپ سے جو فائدہ پہنچا اور جیسی نادر ونایاب اور کمیاب کتابیں اس گروپ کے ذریعہ پڑھنے کو ملیں وہ پہلے سنی بھی نہیں تھیں۔

محترم مولانا محمد فہیم قاسمی بھی ایسے ہی ایک فرد ہیں جن کو میں نے اسی گروپ کے ذریعہ جانا، ان کی تحریروں، ان کے جذبوں اور ان کے ارادوں اور ان کے خانگی وخارجی معاملات ومشکلات اور پھر کامیابی کے ساتھ ان مشکلات کے بھنور سے نکلنے کی تفصیلات

سے واقفیت ہوئی، انہوں نے ''انتخاب مطالعہ'' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا، موصوف کو دوران مطالعہ جو بھی تحریر اچھی لگتی، معیاری محسوس ہوتی، یا لوگوں کے لئے کارآمد ہوتی تو اس کو اپنی ڈائری میں لکھ لیتے اور وہی مختصر تحریر گروپ کی نذر کردیتے، اہل علم کی یہ انجمن دادو تحسین پیش کرتی، بسا اوقات وہ تحریر موضوع بحث بنتی اور پھر ''بات سے بات'' کا سلسلہ چل نکلتا اور وہی سلسلہ دور تک چلتا چلا جاتا، ارباب ذوق، شوق کے ساتھ اب تحریروں کو پڑھتے، محفوظ کرتے اور محظوظ ہوتے۔

یہ کتاب کوئی مستقل تصنیف نہیں؛ بلکہ اُن کا وہی ''انتخاب مطالعہ'' ہے جس کو ''زریں اوراق'' کا نام دیا گیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک کتاب آپ کو بیک وقت درجنوں نئی کتابوں اور سیکڑوں اہل علم وقلم سے متعارف کرائے گی، بہت ممکن ہے کہ اس میں دئے گئے حوالہ جات سے آپ کو نفس کتاب تک پہنچنے کی توفیق ملے اور وہ کتاب آپ کے دل کی دنیا روشن کردے۔

میں عزیز موصوف کو ان کی اس قلمی وعلمی وادبی کاوش پر بصمیم قلب مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کا اشہب قلم یوں ہی طرارے بھرتا رہے، ''بات سے بات'' کا سلسلہ جاری رہے، کتابی دنیا سے نئی نسلوں کی وابستگی بنی رہے اور دین کی کھیتی ہری کی ہری رہے۔

(مفتی) ناصر الدین مظاہری

استاذ مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

۲۵ صفر المظفر ۱۴۴۲ھ

داستان اس مجموعۂ انتخاب کی

عنوان تو ''مجموعۂ انتخاب کی داستان'' کا ہے اور داستان ایسی ہے کہ نہ زبان سے بیان کی جاسکتی ہے اور نہ تحریر کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے، ہاں! اسے احساس کیا جاسکتا ہے، مگر احساس بھی وہی کرسکتا ہے جو یہ کہہ سکتا ہو:

جس دور سے ہم گزرے ہیں
تم گزرتے تو گزر ہی جاتے

پوچھنے والے نے تقریباً تین سال پہلے پوچھا تھا، کہاں ہیں؟ یہ سوال تو دن میں کئی بار پوچھا جاتا؛ مگر اس دن سوال کا جواب دیا گیا، سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کے درمیان ہوں، جو مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں، جو بہترین دوست اور بہترین ہم نشین ہیں، جو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتے، جو اپنے پاس آنے والوں کو علم کی دولت سے نوازتے ہیں، جن کی باتیں بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتیں، جو کسی کی برائی نہیں کرتے، آنے والا اپنا دامن موتیوں سے بھر لیتا ہے، حیرت سے پوچھا گیا، کہاں ہیں؟ بتایا گیا: بچوں کی لائبریری میں کتابوں کے درمیان ہوں، پوچھنے والا وہی ہے جس کے نام کتاب کا انتساب ہے۔

آج جب تنہائی ہے اور اس کا احساس بھی، تو اپنی بچی کے ساتھ انہیں ہم نشینوں

کے پاس خود کو بٹھالیا، جنہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا اور مجھے تاریخی شخصیات کے پاس پھرایا ان کے کارناموں سے روشناس اور ان کی شخصیات سے متعارف کرایا، پھر میں تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں رہا اور وہ جملہ سچ ثابت ہوا کہ جس کا کوئی ہم نشین نہیں کتابیں اس کی بہترین ہم نشین ہیں۔

یہ مجموعہ ''زریں اوراق'' مستقل تصنیف نہیں؛ بلکہ انہیں کتابوں کے دلنشیں اور دل آویز صفحات ہیں، جس میں مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ، قاضی اطہر مبارکپوریؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا مضمون بھی شامل ہے، یہ مجموعہ سوشل میڈیا پر ''انتخاب مطالعہ'' کے نام سے قسط وار پوسٹ کیا جاتا رہا ہے، افادہ عام کی غرض سے یہ مجموعہ بشکل پی، ڈی، ایف نشر کیا جارہا ہے، جس میں حوالوں کے ساتھ پروف ریڈنگ کی بھی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس مجموعہ ''زریں اوراق'' کو افادہ عام کا ذریعہ بنائے۔

محمد فہیم قاسمی گورکھپوری
جامعہ شیخ الہند انجان شہید اعظم گڈھ
بروز دوشنبہ
۱؍ربیع الاول ۱۴۴۲
۱۹؍اکتوبر ۲۰۲۰
بوقت شب: ۱۰:۳۰

بڑوں کی بڑی باتیں

آقائے دو جہاں سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے زرّیں اور تابناک واقعات اور آنحضرت صلی کے انقلابی، اجتہادی اور آفاقی کارناموں کی ایک طویل فہرست کو بغور وخوض دیکھنے کے بعد، ہر سلیم الفطرت، صحیح الحواس اور کامل، اعقل انسان یہ ماننے پر مجبور ہے کہ سردار ذیشان نے بشریت وانسانیت کی حدود ومحدود کے اندر رہ کر اپنی مافوق العادت قوت ارادی وعمل سے اپنے دینی مقاصد کو پورا فرمایا اور ارض بسیط کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے اعتقادی اور عملی فتنوں کی سرکوبی اور بیخ کنی فرمانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، یہ سچ ہے کہ دنیا میں اور بہت سے مصلحین اور مفکرین بھی آتے جاتے رہے، بہت سی اصلاحی تحریکیں اپنی ابتدائی زندگی میں بہت ضعیف وکمزور تھیں؛ مگر آہستہ آہستہ وہ ایک ہمہ گیر طاقت بن کر دنیا پر چھا گئیں، بڑی بڑی سلطنتوں نے ان کا لوہا مانا، بڑے بڑے شہنشاہ ان کے آگے نگوں سار ہوئے اور بہت سی منظم اور مکمل فوجوں اور ان کے حوصلہ مند اور ذی عزت سپہ سالاروں نے اپنی اپنی اطاعت وعقیدت کا مرکز خاص قرار دیا اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، ان میں بہت سی اصلاحی تحریکیں چاہے اپنی حقیقت کے اعتبار سے کتنی ہی مسخ ومحرف کیوں نہ ہوچکی ہوں اور اپنی اصل سے انہیں کتنا ہی بعد کیوں نہ پیدا ہو گیا ہو؛ لیکن بہر صورت اب تک وہ دنیا میں موجود ہیں اور ان کی موجودگی ان تحریکوں کو چلانے اور اٹھانے والے اصحاب وافراد کی ہمت ومحنت کی برابر گواہی دیتی ہیں؛ لیکن ایسی نظیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور مصلح رہنمائے قوم اور رسول ونبی کی زندگی میں نہیں مل سکتی کہ ابتداء اوہ بالکل یکہ وتنہا تھے ایسے کہ ان کی پہلی دعوت حق پر مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عورتوں میں سے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے سوا اور کسی کو ان کی دعوت حق پر

کوئی رغبت نہیں ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن مکہ کے پورے ماحول اور وہاں کے اعلیٰ و ادنیٰ ہر فرد نے ذات قدسی صفات پر طرح طرح کے حملے کئے اور ان کے دعویٰ نبوت و رسالت کا خوب خوب مذاق بنایا، مکہ کی زندگی کے وہ تیرہ سال جو نبوت کی عظیم الشان ذمہ داریوں کو پانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بسر کئے، کون نہیں جانتا کہ وہ ایک طویل محنت وجد وجہد اور کثیر مصائب وآفات سے لبریز نہ تھے؛ مگر خود اپنے وطن، اپنے عزیزوں اور رفیقوں کے درمیان جناب نبی کریم ﷺ کو اتنی کامیابی نہ ہوئی جتنی بعد میں مدینہ تشریف لے جا کر ہوئی، اسلام کے اس مرکز خاص میں اپنی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کو زیادہ وہ پھیلا دینے سے ہوئی، نبوت کے تیرہویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اور سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہجرت اور ترک وطن کے ظاہری اسباب اس کے سوا اور کچھ نہ تھے کہ مکہ میں رہ کر آنحضرت کو اپنے انقلابی مشن کو جاری رکھنا نہایت مشکل ہو گیا تھا؛ مگر کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ نبوت کے تیرہویں سال آپ ان عظیم مشکلات اور خوفناک مخالفتوں کی وجہ سے مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے؛ مگر تشریف لے جانے کے آٹھ سال بعد ہی پھر آپ نے اپنے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کی ایک معمولی سی فوج کے ساتھ مکہ پر یلغار فرمائی مکہ اور مکہ کے تمام سرکش اور سرزور کفار اور مشرکین نے آپ کے سامنے ہتھیار رکھ دیئے، ساری مخالف طاقتیں زیرو زبر ہو گئیں، سب بت کدے اور صنم خانے ڈھے گئے، دشمنوں کو اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا، نہ صرف مکہ آپ کے قدموں میں آ گرا؛ بلکہ عرب وعجم کے سارے ملکوں اور خطوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کے لئے اپنی آغوش پھیلا دی،

قیصر وکسریٰ کے غرور کج کلاہی شرمندہ ہوکر رہ گئے اور روم وفارس کو اپنے آبائی مذہب اپنے جاہلانہ عقائد، اپنے مشرکانہ افعال اور اپنے بیمار تمدن وتہذیب کو چھپانے اور بچانے کے لئے کوئی محفوظ گوشہ میسر نہ آیا۔

جسے چند سال پہلے نہایت بے چارگی اور بے کسی میں اپنے وطن کو خیر آباد کہنا پڑا تھا اور وطن کی نامانوس فضاؤں اور وہاں کے خوش گوار ماحول نے جس کی ایک بات ماننے اور ایک حرف سننے سے انکار کر دیا، صرف چند سال کے بعد اور اہل وطن کو اس کی اطاعت قبول کرنی پڑی، اس کا حکم ماننا پڑا اور اس کی دعوت حق کی مسیحائی نے سبھوں کو مسحور ومسخر کر لیا، شرق وغرب نے آواز دے کر اس ہادی برحق کو اپنی طرف بلایا، شمال وجنوب بیتاب ہو کر چیخ اٹھے اور زمین کا ذرہ ذرہ پکار اٹھا کہ:

نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

آتش پرستوں نے اپنے تمام آتش کدے بجھا دیئے، بتکدوں میں اصنام اور مورتیوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا گیا، جن گرجاؤں میں بڑے بڑے جبہ پوش اور عمامہ بر سر پادری تین کا ایک اور ایک کا تین والا بے ہودہ سبق پڑھا رہے تھے، ان کی زبانوں پر مہر لگ گئی، مندروں اور شوالوں میں ناقوس پھونکنے کے بجائے اذانوں کی دلکش آوازیں اٹھنے لگیں، خشکی وتری پر اسلام کی حکمرانی وسلطانی کا سکہ چلنے لگا، وہ تنہا تھا؛ مگر بقول شاعر:

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

ہزاروں اس کے ساتھی اور لاکھوں اس کے فدا کار اور کروڑوں اس کے نام لیوا پیدا ہو گئے اور آخر کار حجۃ الوداع ۱۰ھ کے موقعہ پر آپ نے لاکھوں فرزندان توحید کے ایک اجتماع میں اپنی کامیابی کا اعلان اور اپنی مشن کی تکمیل پر اظہار اطمینان فرماتے ہوئے ارشاد

فرمایا کہ:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

وہ جدھر سے گزرا، ادھر صداقت ودیانت کے چشمے ابل پڑے، وہ جہاں گیا وہاں حق وانصاف کی سوتیں پھوٹ پڑیں، اس نے جدھر نظر کی ادھر کفر وباطل کی لمبی بسائی ہوئی بستیاں اجڑ گئیں، جہاں جہاں تک اس کی آواز پہنچی وہاں وہاں تک ایمان واسلام کے خزاں دیدہ باغ وبہار میں تازگی اور زندگی کی لہر دوڑ گئی، سبزہ سرسرانے، بادصبا رقص کرنے، درخت اور پودے بے خودی میں جھومنے، آبشار پر کیف نغمے گانے اور پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، کونپل کونپل اس نئے جوبن اور نئی بہار پر اترانے لگے، ہر قدم پر کامیابی اور فتح مندی نے اس کا ساتھ دیا اور ہر نفس وہ انسانیت کے جوہر ابھارنے اور انسانی فضائل کو از سر نو زندہ کرنے اور جگانے کا کام کرتا رہا، کسی نے خوب کہا ہے:

سوائے ظلمتوں کے اور کیا تھا شام دہر میں
مگر ہمارا آفتاب زر فشاں گذر گیا
نفس نفس پہ مغفرت قدم قدم پہ برکتیں
جدھر جدھر کو وہ شفیع عاصیاں گذر گیا
جہاں نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آج تک
وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گذر گیا

لیکن سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو جو پیغام اور جو دعوت دی وہ کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ کیا طریقہ کار تھا کہ اپنوں کی مخالفتوں اور

دوسروں کی عداوتوں کے باوجود ان کی تحریک حق دبی نہیں؛ بلکہ ان مخالف حالات کے باوجود اسے آفاق واطراف میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لشکر وسپاہ، پیل وپیادہ، فوج وخزانہ اور مال و زر کی طاقت تھی کہ ان کے زور سے آپ نے انسانی قلوب پر فتح حاصل کی یا درحقیقت آپ کے پیغام میں ایسی کوئی کشش، آپ کے اخلاق اعمال میں ایسی کوئی جاذبیت اور آپ کی تعلیمات میں ایسی کچھ خوبیاں تھیں کہ دنیا ان کی باطنی طاقت سے مرعوب ومفتوح ہوگئی اور اسے ان کے روحانی فضائل کے اعتراف کے سوا کچھ نہ سوجا۔

سوال گو مختصر ہے؛ مگر ان کا جواب اتنا سہل اور آسان نہیں، اسلام کی حقیقت اور ایمان کی عظمت کو سمجھنے کے لئے مصنفین اسلام کی ان بلند پایہ کتابوں اور تصانیف کے عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے، جن میں اسلام کی تشریح وتعارف اور اسلام کی اصولی تعلیمات کی وضاحت فرمائی گئی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ کسی مختصر مقالہ میں اس موضوع پر روشنی ڈالی جائے؛ البتہ آج کی فرصت میں ہم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خود اپنے گفتار و کردار اور ان کی درسگاہ علم وعرفان میں تربیت پائے ہوئے صحابہ کرام کی انصاف پسندی، سادگی اور سخت کوشی، حیا اور مروت، مساوات اور جذبہ اخوت، عدل اور اعتدال، دینی شعائر کو باقی رکھنے میں ان کی احتیاط اور سخت گیری اور اپنے سے کم درجہ کے مسلمان بھائیوں کو اپنے برابر اور اپنے سے اچھا سمجھنے کی عادت، دین کے آثار ونشانات کو قائم فرمانے میں ان کے اشتغال وانہماک اور دینی ضرورتوں پر اپنی اور دنیا کی ساری راحتوں کو ختم کردینے کے جذبۂ والہانہ کے اظہار کے لئے تاریخ اسلام کے چند واقعات آپ کو سنائیں۔

اگر آپ چاہیں تو اسلام کی عظمت وحقیقت بھی ان ہی واقعات سے آپ سمجھ سکتے

ہیں اور اس کا بھی آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جنہوں نے اسلام کی تاسیس وتجدید فرمائی اور اپنی قیمتی زندگی کے سارے اوقات اسی گلزار کی نخل بندی میں صرف فرما گئے، کس دل و گردے کے انسان تھے؟ ان کا اپنا کردار کیا تھا اور ان کی زندگی میں وہ کون سے محاسن تھے جو ان کے اہم اور کٹھن مقصد کی تکمیل کے ضامن بنے، ان میں نیکی، پرہیزگاری، تقدس احتیاط ودانش مندی، ایثار وجفاکشی، مساوات ومعدلت گستری، پیش بینی اور دوراندیشی کے کون سے جوہر تھے جنہوں نے عرب کے ان ساربانوں کو ریگستان عرب کی بادیہ پیمائی اور اونٹوں اور بھیڑوں کی رکھوالی سے ہٹا کر، مصر وعرب، ہند وایران، روم واندلس اور افغانستان وترکی کے تخت شاہی پر لا بٹھایا، یہ تاریخ اسلام کے چند واقعات ہیں؛ لیکن ان میں پانے والوں کے لئے عزت وموعظت کا بڑا سبق اور حاصل کرنے والوں کے لئے نیکی اور نکوکاری کی بڑی نصیحت پوشیدہ ہے۔

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم

گوش نزدیک لئیم آر کہ آوازے ہست

(۱)

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک دفعہ رؤسائے قریش آپ سے ملاقات کیلئے آئے، تو اتفاقاً حضرت صہیبؓ و بلالؓ و عمارؓ (جو نسلاً غلام تھے) وغیرہ بھی پہلے سے ملاقات کے منتظر تھے، حضرت عمرؓ نے باوجود ان کے غلام اور دنیاوی حیثیت سے کم درجہ کے آدمی ہونے کے، انہیں پہلے شرف باریابی بخشا اور سرداران قریش باہر کھڑے رہے، ابوسفیان کو جو (عرب کے معزز سردار تھے) یہ امر سخت ناگوار گزرا اور کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے کہ غلاموں کو پہلے ملاقات کی اجازت ملتی ہے اور ہماری طرف چشم عنایت نہیں ہوتی،

انہیں میں ایک صاحب نے جواب دیا، دراصل اس معاملہ میں حضرت عمرؓ کا کوئی قصور نہیں، اسلام نے تو سب کو ایک وقت میں ایک ہی آواز سے پکارا تھا؛ مگر شامت اعمال سے جنہوں نے اسکی آواز بعد میں سنی وہ آج بھی بعد میں بلائے گئے ہیں، قاعدہ ہے کہ فضیلت ہمیشہ پہل کرنے والوں کو ہوتی ہے۔

(۲)

مصر کے گورنر حضرت ابن العاصؓ نے جامع مسجد مصر میں منبر بنوایا، حضرت عمرؓ کو اسکی اطلاع ہوئی، تو بارگاہ خلافت سے گورنر کو تنبیہ کی گئی اور تحریر فرمایا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اوپر بیٹھو اور باقی لوگ نیچے بیٹھیں، آخر تم میں ایسی کیا خوبی ہے کہ تم سب سے اوپر بیٹھنا چاہتے ہو اور اوروں میں ایسی کونسی برائی ہے کہ انہیں نیچے بیٹھایا جائے، حضرت عمرؓ کا یہ حکم پاکر عمرو بن العاصؓ نے اپنا ارادہ ترک فرمایا۔

(۳)

جب حضرت عمرؓ بیت المقدس روانہ ہوئے تو باوجودیکہ دشمان اسلام پر رعب جمانے کا تھا؛ لیکن یہاں نقارہ ونوبت اور حشم وخدم سے رعب ڈالنے کا کام کہیں نہیں لیا گیا؛ بلکہ اپنے اعمال اور اخلاق ہی کا مخالفین پر بے ساختہ وبے ارادہ اثر پڑتا رہا، چنانچہ شہنشاہ اسلام کے سفری سامان کا مجموعہ ایک غلام، ایک اونٹنی، پانی کا ایک مشکیزہ، کچھ کھجوریں اور پھٹے پرانے چند کپڑوں پر مشتمل تھا، اب سفر دیکھئے کس شان سے ہوتا ہے، ایک منزل خود سوار ہوتے ہیں اور دوسری منزل پر غلام کو سوار کرتے ہیں اور غلام کی سواری کے وقت خود غلاموں اور خادموں کی طرح اونٹ کی مہار پکڑ کر چلتے ہیں، اتفاق دیکھئے کہ آخری منزل پر غلام کی باری آجاتی ہے، وہ اصرار کرتا ہے کہ اس وقت آپ ہی سوار رہیں؛ مگر ارشاد ہوا کہ

یہ بے انصافی ہے کہ میں دو منزل سواری کا آرام کرلوں، چنانچہ غلام اونٹنی پر سوار اور خلیفۃ المسلمین مہار پکڑے ہوئے لشکر اسلام میں داخل ہوئے، ساری دنیا اس سادگی اور جفاکشی کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور لوگوں کو یقین نہ آیا کہ وقت کا سب سے بڑا فاتح اور دانشمند جرنیل اور اس سادگی کی حالت میں ہے۔

(۴)

حضرت ابن عباسؓ جب جنگ بدر میں گرفتار ہوئے تو صحابہؓ نے اور قیدیوں کی طرح انکے ہاتھ پاؤں بھی جکڑ کر باندھ دیئے، جب ان کے کراہنے کی آواز حضورﷺ کے کانوں تک پہونچی تو آپ پریشان ہوئے، صحابہؓ نے اپنی فراست سے آپ کی پریشانی کو بھانپ کر حضرت عباسؓ کی گرہوں کو ڈھیلا کر دیا، تھوڑی دیر تک جب آپ کو حضرت عباسؓ کے کراہنے کی آواز نہ آئی تو آپ نے صحابہ سے سبب دریافت فرمایا: جواب ملنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے اس امتیازی سلوک کو جائز نہیں سمجھتا یا سب کی گرہوں کو ڈھیلا کر دو یا چچا عباسؓ کی گرہوں کی بھی کس کر باندھ دو۔

(۵)

حضور نبی اکرم ﷺ اپنے مرض الوفات میں حضرت اسامہؓ کو جن کے والد زید بن حارثہؓ غلام تھے، ایک ایسے عظیم الشان لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا، جس میں بڑے بڑے صحابہ اور عرب کے مشہور شرفاء، اور امراء شریک تھے، لشکر کے رخصت ہوتے وقت خلیفہ اسلام حضرت ابوبکرؓ خود بنفس نفیس وبایں عظمت وتقدس دور تک رکاب تھامے ہوئے چلتے ہیں اور حضرت اسامہؓ کو ان کے غیر معمولی اصرار پر بھی اترنے نہیں دیتے اور جب حضرت عمرؓ کو اپنے پاس رکھنے کا ارادہ ہوا تو باوجود مختار اور خلیفہ وقت ہونے کے اتنا گوارا نہیں کرتے

کہ خود ان کی واپسی کا حکم صادر فرمادیں؛ بلکہ باقاعدہ حضرت اسامہؓ سے ان کی واپسی کی درخواست کر کے انہیں ساتھ واپس لاتے ہیں، نبی کریم ﷺ اپنے لئے بھی کوئی امتیاز پسند نہیں فرماتے تھے، مسجد نبوی کی تعمیر اور غزوۂ خندق میں خندق کی کھدائی کے موقع پر خود آنحضرت ﷺ نے عام مسلمانوں کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کیا اور دور سے پتھر ڈھو کر لاتے رہے، ایک دفعہ سفر میں تشریف لے جارہے تھے، سب صحابہؓ نے کھانا پکانے کا انتظام کرنا چاہا تقسیم کار کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے سپرد لکڑیاں جمع کرنے کا کام کردو، صحابہ نے انکار کیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ خدمت لینے پر تیار نہ ہوتے تھے، آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے ساتھ رہ کر ہرگز کوئی امتیاز روا نہ رکھونگا۔

(۶)

حضرت فاطمہؓ کی ایک خادمہ تھیں، جن کا نام فضا تھا، یہ حضرت فاطمہؓ کے گھر کھانا پکانے کا کام کیا کرتی تھیں؛ لیکن دوسرے دن حضرت فاطمہ خود ان کے گھر جا کر انکا کام کرتی تھیں؛ گویا آپس میں آقا و خادمہ کا کام نہیں؛ بلکہ مساویانہ تعلق تھا، ایک دن اس نے ان کا کام کیا اور ایک دن انہوں نے اسکا۔

(۷)

حضرت فاطمہؓ نے ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ہاتھ کے زخم دکھائے اور عرض کیا کہ گھر کے کام و کاج کیلئے ایک غلام کی ضرورت ہے، جواب میں فرمایا کہ تم سے زیادہ فلاں شخص مستحق ہے، پہلے اس کا کام ہو جائے تو پھر دیکھا جائے گا، میں تم سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کرسکتا، شہر میں تم سے زیادہ مستحق ہیں، انہیں کی ضروریات پہلے پوری کی جائیں گی، ہم رشتہ داری اور قرابت داری پر حقوق تقسیم نہیں کرتے۔

(۸)

حضرت عمرؓ سے آپ کے بھائی حضرت عقیلؓ نے روزینہ بڑھانے کی درخواست کی، آپ نے ایک تپتا ہوا لوہا ان کے ہاتھ پر رکھ دیا وہ چلانے لگے تو آپ نے فرمایا کہ تم دنیا کی اس معمولی سی آگ سے چلانے لگے؛ اگر میں تمہارا روزینہ بڑھا دوں تو کل جہنم کی آگ میں کیسے برداشت کرونگا۔

(۹)

مدینہ سے ایک آدمی حضرت علیؓ کی ملاقات کیلئے کوفہ آیا، تو اس وقت سردی کی شدت تھی اور آپ سردی میں کانپ رہے تھے، اس نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ مدینہ سے مجھے ایک ہی چادر ملی تھی، جسے میں ساتھ لایا اور بیت المال تو قوم کی چیز ہے، میں اسے اپنے لئے حرام سمجھتا ہوں۔

(۱۰)

حضرت بلال حبشی غلام تھے صورت وشکل تو درکنار روپیہ پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے؛ لیکن جب شادی کا خیال فرمایا تو بھرے مجمع میں اپنا راز دل ظاہر فرمایا، آپ کا ارشاد سن کر بڑے بڑے سرداران قریش اور ذی رتبہ امراء عرب کی گردنیں جھک گئیں، کسی کو جرأت نہیں تھی کہ اعتراض کا کوئی جملہ زبان پر لائے؛ حالانکہ حضرت بلالؓ انہیں غلاموں میں سے تھے جو قبل از اسلام ایک بالکل دوسری مخلوق سمجھے جاتے تھے، مولانا شبلیؒ نے نظم میں یہ واقعہ بیان فرمایا ہے

بارگاہ نبوی کے جو مؤذن تھے بلالؓ
کر چکے تھے جو کئی سال غلامی میں بسر

جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں
جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
میں غلام حبش اور حبش زادہ بھی ہوں
یہ بھی سن لو نہ ہیں میرے پاس دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہش تزویج بھی ہے
ہے کوئی جسکو نہ میری قرابت سے حذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں دل سے منظور
جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھی تھی نظر
عہد فاروق میں جس دن ہوئی انکی وفات
یہ کہا حضرت فاروق نے بادیدۂ تر
اٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا
اٹھ گیا آج نقیب چشم پیغمبر

(۱۱)

خلیفۂ رابع حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ کی زرہ ایک یہودی نے چرالی تو آپ نے خلیفۂ وقت ہوتے ہوئے یہ خیال تک بھی نہیں کیا کہ اپنی شوکت وحشمت کے اظہار سے شئی مسروقہ یہودی سے برآمد کرالیں، باقاعدہ ماتحت عدالت میں مقدمہ دائر کیا، تاریخ مقررہ پر جب عدالت میں تشریف لائے تو قاضی صاحب ادباواحتراما کھڑے ہوگئے اور اصرار کیا، آپ تشریف رکھیں؛ مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں، اس وقت میں مدعی کی حیثیت میں حاضر ہوا ہوں، مجھ میں مدعا علیہ میں فرق نہیں ہونا چاہیے، یہ تو آپ کا جذبہ مساوات تھا،

اب قاضی صاحب کا فیصلہ ملاحظہ ہو، انہوں نے صورت حال معلوم کر کے حضرت علیؓ سے گواہوں کا مطالبہ کیا، آپ نے گواہی کیلئے اپنے صاحبزادہ اور غلام کو پیش کیا، قاضی صاحب نے کہا کہ ان دونوں کی گواہی از روئے شریعت آپ کے حق میں معتبر نہیں، لہٰذا مقدمہ خارج؛ مگر حضرت علیؓ خوش خوش اپنے گھر تشریف لائے اور یہ خیال تک بھی نہ ہوا کہ میں خلیفہ ایک یہودی کے مقابلہ میں ناکام رہا، دراصل دین اور مذہب اور اسکے احکام وارشاد پر ان حضرات کی گردنیں ہر وقت جھکی رہتی تھیں۔

(۱۲)

نبی کریم ﷺ نے جمعۃ الوداع کے موقع پر آخری بار اپنی قوم کو اجتماعی حیثیت سے خطاب فرمایا تھا، اس وقت لاکھوں مسلمان آنحضرت ﷺ کے پیش نگاہ تھے، جانثاروں کا ایک جم غفیر ذات شاہانہ کے قدموں پر نثار ہونے کیلئے بے تاب تھا، آپ نے فرمایا کہ لوگو! میری بات غور سے سنو! شاید اس کے بعد ہمیں حج کرنے کا موقع نہ ملے، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، تم سب اولاد آدم ہو اور آدم کی پیدائش خاک سے ہوئی، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔

ایک زندہ فاتح اور بیدار قوم کا یہ رہنمائے اعظم جس وقت اپنی قوم سے خطاب کر رہا تھا اسوقت اس کے تخت شاہی کا مسند (کجاوہ) ایک درہم سے زیادہ کا نہ تھا اور اسکے بدن پر حریر و دیبا کے ملبوسات اور اطلس کی قبائیں نہیں؛ بلکہ موٹے کھردرے اور پھٹے پرانے کپڑوں کی چادریں تھیں، بہت کم قیمت کی۔

(۱۳)

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں غسان کا فرمانروا جبلہ ابن ایہم مسلمان ہو کر

آیا، عین اس حالت میں جبکہ وہ طواف بیت اللہ میں مشغول تھا، اس کی چادر کے گوشہ پر ایک غلام حبش کا پاؤں غلطی سے پڑ گیا، جبلہ رعونت میں آ کر اس کے منھ پر ایک تھپڑ مارا، غلام نے دربار فاروقی میں استغاثہ کیا، وہاں سے حکم ہوا کہ تم بھی تھپڑ مار کر اپنا بدلہ لے لو، جبلہ ایک بادشاہ تھا، حکم سنتے ہی غصہ سے بیتاب ہو کر بولا، کہ اس غلام کی کب یہ جرأت ہو سکتی ہے، مجھ جیسے آدمی پر ہاتھ اٹھائے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اعلیٰ وادنیٰ کی کوئی تمیز نہیں یا تو تم اس غلام سے معافی مانگ لو اور یا سزا بھگتنے کیلئے تیار ہو جاؤ، جبلہ نے مجبور ہو کر ایک دن کی مہلت مانگی اور راتوں رات بھاگ کر قسطنطنیہ ہرقل کے پاس پہونچ گیا؟ جہاں اسکی بہت قدر و منزلت کی گئی تاہم مرتے دم تک دین اسلام کی اعلیٰ مساوات اور برابری سلوک کا معترف رہا اور اس نے ہمیشہ اسلام کے نظام عمل کی تعریف کی، کہتا تھا کہ طبقات کا یہ اونچ نیچ اگر کسی نے ختم کیا ہے تو صرف اسلام نے۔

(۱۴)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، رسول کریم ﷺ سے قرابت ہے اور ان دس صحابیوں میں سے ایک ہیں، جنہیں حضور اکرم ﷺ نے زندگی میں جنت کی بشارت دی تھی، جب ایرانی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا شہنشاہ ایران نے پوری قوت سے مقابلہ کا ارادہ کیا، اپنے مشہور سپہ سالار رستم کو لاکھوں فوجیوں کے ساتھ اس عزم کے ساتھ بھیجا کہ مسلمانوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دیا جائے، اس وقت عرب میں بڑی ہلچل مچ گئی، تمام مسلمانوں کی رائے ہوئی کہ خود حضرت عمرؓ لشکر اسلام کے امیر ہوں، حضرت عمرؓ بھی اس پر آمادہ تھے؛ لیکن اکابر صحابہ نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا انہوں نے کہا: کہ آپ کا جانا کسی بھی طریقہ سے مصلحت کے مطابق نہیں ہے، اپنے بجائے کسی دوسرے شخص کو بھیج

دیجئے اور آپ یہاں مرکز میں رہ کر تمام اندرونی و بیرونی معاملات پر نظر رکھئے، بالآخر صحابہ کرامؓ کے مشورہ اور پورے غور و خوض کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس اہم خدمت کیلئے نامزد ہوئے، اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ حضرت سعدؓ کی حیثیت رسول کریم ﷺ حضرت عمرؓ اور صحابہ کرامؓ کی نظر میں کس قدر بلند تھی؛ لیکن اس اہمیت کے باوجود ان کے متعلق اطلاع ملی کہ انہوں نے کوفہ میں ایک عالی شان محل بنوالیا ہے اور اس میں ایک زبر دست پھاٹک لگوایا ہے اور دربان مقرر کیا ہے تو حضرت عمرؓ نے فوراً محمد بن مسلم کو خط دے کر روانہ کیا اور فرمایا کہ ہمیں جو اطلاع ملی ہے؛ اگر وہ صحیح نکلے تو تم بے تکلف پھاٹک مین آگ لگا دینا، اس حکم کے مطابق حضرت محمد بن مسلمہ کوفہ روانہ ہوئے اور پہنچے تو دیکھا کہ واقعی شاندار محل بنا ہوا ہے اور اس میں ایک عظیم الشان پھاٹک لگا ہوا ہے، یہ دیکھ کر انہوں نے امیر المومنین کے حسب الحکم پھاٹک میں آگ لگادی، جب آگ کے شعلے بلند ہوئے اور حضرت سعدؓ نے باہر آ کر آتشزنی کا سبب دریافت کیا تو حضرت محمد بن مسلمہ نے امیر المومنین کا خط حوالہ کیا، جس میں لکھا ہوا تھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک محل بنوایا ہے اور ایک زبردست پھاٹک لگوایا ہے، اس کا انجام یہ ہوگا کہ اب دروازہ پر دربان بیٹھے گا اور حاجت مندوں کو بے روک ٹوک تمہارے پاس پہونچنا ممکن نہ ہوگا، اس لئے محمد بن مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس پھاٹک کو پھونک دیں، تاکہ عوام الناس کو تم سے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔

(۱۵)

حضرت عمرؓ ایک دفعہ راستے سے گزر رہے تھے کہ خیال آیا کہ عمر! خدا کو کیا جواب دو گے، تمہارا عامل مالک ابن غنم مصر میں تمہاری ہدایات کی خلاف ورزی کر رہا ہے، بڑے

ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتا ہے، دروازہ پر دربان مقرر ہے، جسم پر باریک کپڑے ہیں، یہاں بھی آپ نے محمد بن مسلمہ کو روانہ کیا اور حکم دیا کہ توجہ سے حالات کی تحقیق کرو، محمد بن مسلمہؓ پہونچے تو معلوم ہوا کہ شکایت صحیح ہے، حکم کے مطابق مالک ابن غنم مدینہ منورہ حاضر ہوئے، یہاں حضرت عمرؓ ایک کمبل کا کرتہ دیا کہ اسے پہن کر جنگل جاؤ اور بکریاں چراؤ اس امیرانہ زندگی کے بعد ان کیلئے ایک کمبل کا کرتہ پہن کر بکریاں چرانا بہت ہی شاق تھا، کہتے تھے کہ ہائے اس زندگی سے تو موت بہتر ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس میں اتنی ناگواری کی کیا بات ہے، تم تو غنم کے بیٹے ہو، ان کا نام غنم اسی لئے تو تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتے تھے۔

(۱۶)

حضرت عمرؓ شام کے دورہ سے واپس آرہے تھے، راستہ میں ایک بہت بوڑھی عورت نظر آئی، اس نے اس سے پہلے حضرت عمرؓ کو نہیں دیکھا تھا، آپ نے فرمایا کہ بڑی بی کچھ عمر کا بھی حال معلوم ہے، وہ آج کل کس رنگ میں ہے، بوڑھی نے کہا کہ سنا ہے شام کا دورہ کر کے واپس آرہا ہے، خدا اسے غارت کرے، مجھے اس سے کوئی فیض نہیں ہونچا، آپ نے کہا کہ بڑی بی اس قدر خفا نہ ہو اس بے چارہ کو کیا معلوم تھا کہ تم کہاں ہو اور کس حال میں؟ جواب سن کر بڑی بی کو بہت تاؤ آیا، بگڑ کر بولیں، جب رعایا کی خبر گیری نہیں کر سکتا تو اتنی بڑی سلطنت کا بوجھ کیوں سر پر لاد رکھا ہے، یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی ذمہ داری کو سوچنے لگے، قیامت کا منظر نگاہوں کے سامنے آگیا، سلطنت کے متعلق خدا کے حضور میں حساب وکتاب کے تصور سے دل لرز اٹھا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند رجنوری ر ۱۹۷۰ء۔ مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ

مطالعہ وتعلیقات

بڑی بڑی نیکی کے چھوٹے چھوٹے کام:

ایک مرتبہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! مالدار لوگ اجر وثواب میں ہم سے بازی لے جاتے ہیں، وہ بھی نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور وہ بھی ہماری ہی طرح روزے رکھتے ہیں؛ مگر وہ اپنے فاضل مال میں سے صدقہ کرتے ہیں، اس لئے اجر میں ہم سے بڑھ جاتے ہیں، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو وہ چیز نہیں دی ہے جس سے تم بھی صدقہ کرو؟ ہر تسبیح (سبحان اللہ) کہنا صدقہ ہے، ہر تکبیر (اللہ اکبر) کہنا صدقہ ہے، ہر تحمید (الحمد للہ) کہنا صدقہ ہے، ہر تہلیل (لا الہ الا اللہ) کہنا صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، نہی عن المنکر صدقہ ہے اور تمہاری شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے، یہ جملہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنی شہوت اور جنسی خواہش پوری کرتے ہیں کیا اس میں بھی صدقہ ہے؟ صدقہ کا ثواب ہے؟ آپ نے اس سوال کا جواب سوال ہی کے پیرائے میں دیتے ہوئے ان سے پوچھا، کہ تم ہی بتاؤ اگر کوئی اپنی یہ خواہش حرام کاری سے پوری کرے تو کیا اس پر گناہ نہیں ہوگا؟ اسی طرح جب اسے حلال اور جائز جگہ میں پورا کرے گا تو اس کے لئے اجر وثواب ہوگا۔ (مسلم شریف)

نیکی کی راہیں بہت ہیں، ہر انسان اپنے خاص حالات میں رہ کر نیکی کر سکتا ہے اور کسی حال میں کسی شخص کو محرومی نہیں ہو سکتی ہے، سرمایہ داری اور مالداری ہی سے نیکی نہیں

کمائی جاتی؛ بلکہ غربت و افلاس میں بھی اس کے مواقع ہیں؛ بلکہ اس حالت میں نہایت آسان طریقہ پر انسان نیکی حاصل کرسکتا ہے۔

دیکھو اس حدیث میں صدقات وخیرات کے اجر وثواب کے کیسے کیسے آسان طریقے بتائے گئے ہیں، جن کا تعلق معاملات سے زیادہ ہے، عبادات کے بارے میں تو امیر و غریب تقریباً برابر ہیں؛ اگر کوئی نادار زکوۃ دینے کے قابل نہیں ہے، حج کی استطاعت نہیں رکھتا اور مال کے ذریعہ نیکی نہیں کما سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرکے نیکی کما سکتا ہے؛ حتی کہ حلال اور زن وشوئی کی زندگی کے کاموں کو صدقات و خیرات بنا سکتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم کسی بھی نیکی کو حقیر اور معمولی نہ سمجھو؛ اگرچہ اتنا ہی ہو کہ اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی سے ملاقات کرو۔

(مسلم شریف)

یعنی کسی مسلمان سے خندہ پیشانی اور کھلے دل اور کھلے چہرے سے ملنا بھی نیکی اور معروف ہے اور اس میں بھی اجر وثواب ہے اور اسی کے مقابلہ میں اپنے بھائیوں سے برے انداز میں ملنا، منہ بسورے ہوئے ملنا اور چہرے سے بے لطفی و بے رخی ظاہر کرکے ملنا گناہ ہے، کسی سے یوں ملنا چاہئے کہ تم کو دیکھ کر اس کا غم تھوڑی دیر کے لئے دور ہو جائے اور خوشی سے اس کا چہرہ بھی دمک اٹھے اور تم سے مل کر نشاط و انبساط ہو اس میں صدقات و خیرات کا ثواب ہے اس کا تعلق بھی معاملات سے ہے۔

اپنوں کا خیال رکھو:

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ہم چھ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت حاضر تھے، اسی حال میں مشرکین مکہ آئے اور آپ سے کہنے لگے کہ ان لوگوں کو ہٹادیجئے تاکہ یہ لوگ ہمارے سامنے جرات نہ دکھائیں، ان چھ لوگوں میں، میں، عبداللہ بن مسعود، ایک آدمی قبیلۂ ہذیل کا، بلال اور دو آدمی اور تھے جن کے نام مجھے معلوم نہیں، مشرکین کی اس بات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کچھ اس قسم کا خیال پیدا ہوا تو اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی:

ترجمہ: اوران لوگوں کومت ہٹایئے جوصبح وشام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، اس کی رضا چاہتے ہیں۔ ایضا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مفلس و بے کس صحابہ کو لے کر مکی زندگی میں کفار و مشرکین کی طرف سے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے رہے؛ مگر ان مخلص اور اللہ کے نیک بندوں کی ہر طرح دل جوئی اور خاطرداری فرماتے تھے اور کسی موقع پر ان کی طرف سے بے توجہی نہیں فرماتے تھے، ساتھ ہی آپ اسلام کی دولت پہنچانے پر حریص تھے اور ہر وقت اسی خیال میں رہا کرتے تھے کہ قریش اور اہل مکہ کسی طرح اسلام قبول کرلیں، اسی لئے ایک موقع پر جب خود ان کی طرف سے رغبت معلوم ہوئی اور انہوں نے آپ کے پاس آنے کے سلسلہ میں اپنی بڑائی کی وجہ سے کہا کہ آپ اپنے پاس سے ان لوگوں کو ہٹادیں تاکہ یہ لوگ ہمارے سامنے جرات نہ دکھائیں تو آپ کے دل میں ان کے اسلام کی خاطر خیال پیدا ہوا کہ اس وقت ان لوگوں کو ہٹادیا جائے؛ مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور ان بے کس و مجبور بندوں کے مقابلہ میں شریروں اور متکبروں کی بات نہیں چلنے دی، آپ کا خیال اسلام کی اشاعت کے خیال سے تھا، ورنہ آپ اپنے دوستوں اور صحابہ کے بارے میں بہت ہی شفیق ومہربان تھے اور اپنے لوگوں کا یوں ہی خیال کرنا چاہئے۔

ہر زمانے کے لئے علماء:

ابو تراب نخشیؒ ۲۴۵ھ میں فوت ہوئے ہیں یہ اس دور کے اہل اللہ اور اولیاء میں ہیں، جب زہد وتصوف کے نام پر عجمیت کا رنگ بزرگوں میں نہیں آیا تھا اور ان کے زہد و تصوف میں سراسر اسلامی احسان کی روح کارفرما تھی، خشیت الٰہی کے ساتھ ساتھ تقویٰ معیار تھا، ان کا ایک مقولہ امام تاج الدین سبکیؒ نے طبقات الشافعیہ میں نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ان اللہ ینطق العلماء فی کل زمان بما یشاکل اعمال اھل ذلک الزمان. اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں علماء سے وہی باتیں نکلواتا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے عمل کے مناسب ہوتی ہیں۔ (طبقات الشافعیہ ج ۲/۳۱۰)

علمائے اسلام پر یہ فضل خداوندی ہمیشہ رہا ہے کہ ان کا عام طبقہ اور اکثریت ہمیشہ دین اور مسلمانوں کی ضروریات وحاجات کے مطابق کام کرتی ہے اور جس دور میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے جو چیز ضروری ہوتی ہے وہ اسے پورا کرتے ہیں، آج بھی اس ملک میں مسلمانوں کو اپنی زندگی کے لئے جو حالات مناسب یا ضروری ہیں علماء ان کے لئے اپنے اپنے انداز میں کام کررہے ہیں؛ گو ان کے طریقہ کار میں کچھ اختلاف ہے؛ مگر سب اسی کام میں مصروف ہیں، جو آج کے حالات میں امت کے لئے مفید اور ضروری ہیں، حالانکہ ایک طبقہ کہتا رہتا ہے کہ مولوی زمانے کے ساتھ دینے سے عاجز ہیں اور یہ زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتے، یہ بھی درست ہے کیوں کہ علماء کا کام زمانے کے ساتھ چلنا نہیں؛ بلکہ زمانے کو اسلام کے ساتھ چلانے کی کوشش کرنا ہے۔

مردہ دل عالم:

حضرت مالک بن دینارؒ نے ایک مرتبہ امام حسن بصریؒ سے سوال کیا، عالم کی سزا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کے دل کی موت، پھر مالک ابن دینارؒ نے پوچھا قلب کی موت کا کیا مطلب؟ اس پر امام حسن بصریؒ نے فرمایا:

طلب الدنیا بعمل الآخرہ. اخرت کے عمل کے ذریعہ دنیا طلب کرنا۔

(کتاب الزہد والرقائق ۱۳۲)

فی نفسہ دنیا کی طلب کوئی غلط کام نہیں ہے اور عالم و غیر عالم سب کو اس دنیا میں کچھ دنوں رہنا ہے، تو اس کے لئے انتظام کرنا ضروری ہے، شریعت نے اس کی سخت تاکید کی ہے اور شرعی حدود و قیود کے ساتھ دنیا طلب کرنے کا حکم دیا ہے؛ مگر حلال و حرام کی تمیز، حقوق کی ادائیگی اور اعتدال ضروری ہے، ورنہ دنیا طلبی مذموم ترین حرکت ہو جائے گی، پس علماء کو بھی جب دنیا میں رہنا ہے تو اس کا انتظام کرنا ضروری ہے اور دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنے بال بچوں کے بارے میں دنیا کے بقدر مایکفی محتاج ہیں؛ مگر ان کے لئے سب سے بڑا عذاب اس دنیا میں یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر دنیا حاصل کریں اور تقربات و عبادات پر دنیا والوں سے قیمت وصول کریں، آخرت کے اعمال نماز، روزہ، حج، زکوۃ، دینی علوم، دینی مسائل اور اسی طرح کی چیزیں ہیں ان پر اجر چاہنا اور ان کی قیمت وصول کرنا دل کو مردہ کر دیتا ہے، البتہ اگر کسی عالم کی مصروفیت دینی امور و معاملات میں اس قدر زیادہ ہو کہ وہ بقدر ضرورت دنیا حاصل کرنے کا موقع پاتے ہوں تو اسی قدر ان کی خدمت کی جاسکتی ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ مگر ایسی صورت میں بھی دنیا طلبی کو مقصد بنانا دل زندہ کو مردہ کر دیتا ہے، ہم کو ایسے مردہ دل عالم بہت نظر آتے ہوں گے جو دین کے نام پر دنیا

کماتے ہیں، ان کے بدن پر زرق برق کپڑے ہوتے ہیں، زبان قینچی کی طرح چلتی ہے، ان کا ظاہر بھڑ کدار ہوتا ہے اور ان کی وضع قطع بہت خوب معلوم ہوتی ہے؛ مگر ان کے چہروں سے حرص و آز اور فریب کاری ظاہر ہوتی ہے، ان میں عزت نفس، شرافت طبع اور بلند حوصلگی نہیں ہوتی کیوں کہ ان کا دل مردہ ہوتا ہے۔

منافقت کی خشیت:

حضرت ابو درداؓ یا حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ تم لوگ منافقت کے خشوع سے اللہ کی پناہ مانگتے رہو، لوگوں نے سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے، فرمایا:

ان یری الجسد به خاشعا و القلب لیس بخاشع. منافقت کا خشوع یہ ہے کہ اس سے جسم پر خشیت نظر آئے؛ مگر قلب میں خشیت نہ ہو۔

مکاروں اور دنیا داروں کا حال کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو بزرگ اور زاہد کرنے کے لئے نگاہ نیچی رکھتے ہیں اور جسمانی حرکات وسکنات سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ بڑے متقی اور خدا ترس ہیں؛ مگر ان کا دل بڑا جری ہوتا ہے، اس میں خشیت الٰہی ذرہ برابر نہیں ہوتی ہے کیوں کہ ان میں ایمان ویقین کی خشیت نہیں ہوتی ہے، اور نفاق کے رنگ میں وہ عوام کے سامنے آتے ہیں، غلط قسم کے پیر زادے اس مرض نفاق میں دوسرے مولویوں کے مقابلہ میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں، اور اپنے حلقہ مریدین میں اپنے کو بزرگ ظاہر کر کے منافقت کرتے ہیں۔

دنیا سے محبت اور موت سے نفرت:

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ ایک زمانہ آنے والا ہے

جب مسلمانوں کو دوسری قومیں یوں چکھیں گی جس طرح دسترخوان پر اشیاء خوردنی چکھی جاتی ہیں اور وہ مسلمانوں کو اچکیں گی، صحابہ کرام نے تعجب کے ساتھ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مسلمانوں کو دوسری قومیں اس طرح کیوں سمجھیں گی، کیا اس زمانے میں ان کی تعداد بہت کم ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، ان کی تعداد کم نہیں ہوگی؛ بلکہ وہ بہت زیادہ ہوں گے، بات یہ ہوگی کہ ان کے میں ''وھن'' کا مرض عام ہو جائے گا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ''وھن'' کیا چیز ہے؟

آپ نے فرمایا:

حب الدنیا و کراھیة الموت. دنیا کی محبت اور موت سے بھاگنا۔

یہ ''وھن'' کے لغوی معنی کمزوری کے ہیں؛ مگر یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قومی اور اجتماعی امراض سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو ''وھن'' فرمایا ہے، یعنی قومی اور اجتماعی کمزوری دنیا کی محبت اور موت سے گریز کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور یہی بیماری جب مسلمان قوم میں پیدا ہو جائے گی تو دنیا کی دوسری قوموں کیلئے لقمہ تر بن جائے گی اور ان کو یوں مزے لے کر چٹ کریں گے جیسے کسی دسترخوان والے اس کی مرغوب چیزوں کو لذت لے کر کھاتے ہیں، دیکھ لو آج مسلمانوں کی بھیڑ اس مرض میں مبتلا ہو کر لقمہ تر بن رہی ہے اور فتنہ فساد کا نام سن کر اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگتی ہے اور لوٹ مار کرنے والے خالی گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرتے ہیں اور ''خانہ خالی دیو می گیرد'' کا معاملہ ہو رہا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ حالیہ فسادات میں جس جگہ کے مسلمان جمے رہے وہاں نہ فسادیوں کا بس چلا، نہ گھر جلا، نہ لوٹ مار ہوئی اور اگر کسی مفسد گروہ نے شرارت کی تو فوراً ناکام ہونا پڑا؛ مگر اسی جگہ کے دوسرے علاقہ سے مسلمان فساد کی خبر سن کر جان لے کر بھاگے تو ان کا سب کچھ تباہ و برباد ہو

گیا، فتنہ وفساد برپا کرنا انسانیت سوز حرکت ہے؛ مگر مفسدوں اور فسادیوں کا مقابلہ کر کے اپنا دفاع کرنا ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے، اس حق کا استعمال نہ کرنا اور بستیاں چھوڑ کر بھاگنا موت سے بھاگنا اور دنیا ہی کو پسند کرنا ہے، جس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔

بے گور و کفن مردان وفا:

حضرت اسود بن کلثوم عدویؒ بڑے عابد و زاہد اور بزرگ تابعی تھے، وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ قیامت کے دن ان کا حشر وحوش وسباع اور طیور کے شکم سے ہو۔

وکان الاسود یدعو ربہ ان یحشرہ من بطون السباع والطیر۔ اسود اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ ان کا حشر درندوں اور چڑیوں کے شکم سے ہو۔

اللہ کے اس برگزیدہ بندے کی دعا قبول ہوئی اور ایسا ہی ہوا، کہ ایک جہاد میں وہ شہید ہوئے اور ان کے کفن دفن کا موقع بھی نہ مل سکا۔

صورت یہ ہوئی کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں ۲۸ھ یا ۲۹ھ میں حضرت عبداللہ ابن عامر بن کریزؓ نے اسود بن کلثوم عدوی کو خراسان کے شہر بیہق کی مہم کا امیر بنا کر روانہ کیا، بیہق والوں نے اسلامی فوج کی آمد کی خبر سن کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے، فوج کا ایک دستہ اندر گھسا اور دشمنوں نے اس کو گھیر لیا، ان میں حضرت اسود اور ان کے ساتھی تھے، نتیجہ کے طور خون ریز جنگ ہوئی اور یہ تمام کے تمام اسلامی سپاہی شہید ہو گئے، اس کے بعد اسود کے بھائی ادہم بن کلثوم عدوی نے کمان سنبھالی اور بیہق کو فتح کیا اور حضرت بن کلثوم کی دعا کی قبولیت یوں ظاہر ہوئی کہ

فلم یوارہ اخوہ و دفن من استشھد۔ اسود کے بھائی ادہم نے ان کو دفن نہیں کیا؛ حالانکہ دوسرے شہداء کو دفن کیا۔ (فتوح البلدان، ۳۹۵)

حضرت اسود کے بھائی حضرت ادہم کا دل گرروہ تو دیکھو کہ تمام شہداء کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا اور سب کو دفن کیا؛ مگر اپنے بھائی کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ دیا، ان کو معلوم تھا کہ انسانی لاش کو بغیر گور و کفن کا انجام کیا ہوگا؛ مگر انہوں نے ان کی دعا کی قبولیت کے احترام میں ان کو بے گور و کفن ہی رکھا، بے شک قیامت کے دن حضرت اسود وحوش وطیور کے بطن سے اٹھیں گے اور ان ہی پر کیا موقوف ہے، جو مسلمان اللہ کی راہ میں یا مظلومیت کی موت مرکر، بے گور و کفن رہ جائے گا، اس کا حشر بھی اسی شان و انداز سے ہوگا کہ اہل محشر رشک کریں گے اور یہی حال ان مظلوم شہداء کا ہے، جو فسادات میں شہید ہوتے ہیں اور ان کی لاشیں بے گور و کفن رہ جاتی ہیں، ان شہداء کے بڑے مراتب ہیں، اللہ تعالی کے فضل سے مسلمانوں کو ایسے عقائد دیئے گئے ہیں جو ان کو سدا بہار رکھتے ہیں اور وہ کسی وقت مایوسی و ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے، یہی زندہ قوم کی نشانیاں ہیں اور زندہ رہنے کے اصول ہیں۔

جم کر حالات کا مقابلہ کرو:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا کے مومن کا معاملہ عجیب ہے؛ اگر اسے تکلیف و مصیبت پہنچے اور وہ اس پر صبر و استقامت سے کام لے تو اس کے لئے اجر و ثواب ہے اور اگر اسے آرام و راحت پہنچے اور اس پر شکر ادا کرے تو اسکے لئے اجر و ثواب ہے۔ (حدیث شریف)

خوب یاد رکھو جو تم کو آج طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور قتل و غارت، لوٹ مار اور آتش زنی کا بھوت اپنی ذریات کو پھیلا کر تم کو عظیم ترین ابتلاء و آزمائش میں ڈال رہا ہے؛ اگر تم اس میں صبر و استقامت سے کام لوگے تو اجر و ثواب کے علاوہ حالات سازگار رہوں گے، اللہ کا نام لے کر اپنی اجتماعیت کو مضبوط رکھو، گھروں سے نکل کر نہ بھاگو؛ بلکہ یکجا رہ کر حالات کا مقابلہ کرو اور ترکی بہ ترکی جواب دو؛ مگر یہ ضروری ہے کہ

اسلامی عقائد و اعمال اور اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر سب کام ہوں؛ ورنہ ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤ گے، کسی بے گناہ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ اور ظالم کو ظلم سے ہر طرح روکو۔

بزدلی اور حوصلہ مندی

عہد فاروقی میں فتح مدائن کے موقع پر مسلمانوں نے دریا پار کر کے سرزمین ایران میں قدم رکھا تو ایرانی فوجوں نے ان کو حیرت و تعجب سے دیکھ کر شور مچانا شروع کیا کہ

"دیواں آمدند، دیواں آمدند" یعنی دیو، جن آگئے۔

انہوں نے مسلمانوں کی بے جگری اور بہادری دیکھ کر ان کو انسان کے بجائے دیو، جن کہنا شروع کیا۔

سب سے پہلے اسلامی فوج کے امیر حضرت سعدؓ نے بسم اللہ پڑھ کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا، اس کے بعد تمام اسلامی فوج نے اپنے گھوڑے دریا کی موجوں کے حوالے کر دیے اور بنو طے کے ایک اسلامی سپاہی سلیک بن عبد اللہ کے علاوہ تمام فوجی صحیح و سلامت پار ہو گئے، ان کا گھوڑا اپنی یال جھاڑتا ہوا کنارے آ کر کھڑا ہو گیا اور وہ غرق ہو کر شہید ہو گئے، اس موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ بھی موجود تھے، آپ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

یا معشر المسلمین ان اللہ ذلل لکم البر ما والذی نفسی بیدہ لیغیرن و لیبدلن. اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا جس طرح اس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اب یہ ایرانی قوم زیر و زبر کر دی جائے گی۔ (اخبار الطوال ر ۱۲۷)

چنانچہ یہی ہوا کہ مسلمانوں نے دریا پار کر کے حملہ کرنا شروع کیا اور ایرانی فوج

نے جوابی کاروائی شروع کی ،مگر ایرانی فوج کا حوصلہ اس کے اسی جملہ سے معلوم ہوگیا تھا جو انہوں نے مسلمانوں کو دیکھ کر زبان سے ادا کیا تھا، مسلمانوں کا حوصلہ حضرت سلمان فارسیؓ کی مختصر تقریر سے معلوم ہوگیا، ایک طرف حیرت، استعجاب اور مایوسی تھی اور دوسری طرف حوصلہ مندی، خدا کی ذات سے تعلق اور قوت اقدام تھا، جب کوئی قوم مردہ ہونے والی ہوتی ہے تو اس میں بزدلی آجاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں جب کسی قوم میں زندگی آنے والی ہوتی ہے تو اس میں حوصلہ مندی پیدا ہوتی ہے۔

غرور کا سر نیچا:

۱۰۲ھ میں افریقہ کا اموی امیر یزید بن مسلم قتل کیا گیا، اس کے قتل کے واقعہ میں عبرت ہے، نصیحت ہے، محمد بن یزید انصاری کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں مجھے حکم دیا کہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں جس قدر قیدی جیل خانہ میں تھے، سب کو رہا کردو، میں نے جاکر تمام قیدیوں کو رہا کردیا، البتہ یزید بن ابو مسلم کو نہیں چھوڑا، اس نے اسی وقت مجھے قتل کرنے کی نذر مان لی، پھر جب عمر بن عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے یزید بن ابو مسلم کو افریقہ کا حاکم وامیر بنایا، میں ان دنوں وہیں تھا، مجھے گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، یہ رمضان کا مہینہ تھا، یزید بن ابو مسلم نے مجھے دیکھ کر کہا کون محمد بن یزید؟ میں نے کہا: ہاں، اس نے کہا:

الحمد لله الذی امکن منک بلا عهد ولا عمد فطالما سألت الله ان یعیدنی منک. اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تم کو میرے قبضے میں بغیر کسی شرط اور معاہدہ کے دے دیا میں نے دعا کی تھی کہ اللہ تم کو میرے قبضہ میں دیدے۔

میں نے اس کے جملوں کو سنتے ہی فوراً کہا:

وانا طالما سألت الله ان یعیذنی منک. میں نے بھی اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ مجھے تم سے بچالے۔

اس نے میری بات سن کر کہا:

والله ما اعاذک الله منی، والله لو ان ملک الموت سابقنی الیک لسبقته. مگر اللہ نے مجھ سے نہیں بچایا، خدا کی قسم! اگر ملک الموت بھی اب مجھ سے آگے جانا چاہے گا تو میں اس سے آگے رہوں گا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مغرب کی نماز کے لئے اقامت کہی گئی اور یزید ابن ابو مسلم نے نماز شروع کی، ایک رکعت پڑھ چکا تھا کہ فوج کے سپاہیوں نے اس پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ (تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ج ۲/ص ۱/۲۷۴)

چند منٹ پہلے یزید ابن ابو مسلم نے کہا تھا کہ اگر ملک الموت بھی میرے آگے جانا چاہے تو نہیں جا سکتا اور میں اس سے آگے رہوں گا اور یہ کیا ہو گیا کہ مسجد کے فرش پر ڈھیر ہو گیا، سچ ہے غرور کا سر نیچا ہوتا ہے، کبھی تو فوراً ہی اور کبھی عام طور سے کسی موقع پر؛ مگر ہوتا ضرور ہے۔

معذوروں کی عظمت:

حضرت عثمان ابن ابو العاص ثقفیؓ فاتحین ہند میں ہیں، آخری دور میں بصرہ میں مقیم ہو گئے تھے، بصرہ کے دوران قیام میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ

ذهبتم بالاجور یا معشر الاغنیاء تصدقون وتعتقون وتحجون.

اے مالدار لوگو! آپ لوگ صدقہ کرتے ہیں، غلام آزاد کرتے ہیں، اس طرح خوب خوب

ثواب لوٹتے ہیں۔

یہ سن کر حضرت عثمانؓ نے اس شخص سے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ہم پر رشک کرتے ہو؟ انہوں کہا کہ ہاں ہم لوگ رشک کرتے ہیں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

فواللہ ان درھما یاخذہ احدکم من جھد و یضعہ فی حق، خیر من عشرۃ آلاف یأخذ احدنا غیضا من فیض ای قلیلا من کثیر. خدا کی قسم! ایک درہم جو تم میں کوئی محنت مشقت سے حاصل کرتا ہے اور اسے حق کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ ایک درہم ہمارے دس ہزار درہم سے بہتر ہے، جسے ہم میں سے کوئی زیادہ میں سے تھوڑا پاتا ہے۔

حلم ووقار:

حضرت حسن بن علیؓ بڑے باوقار بردبار اور حلیم وسنجیدہ بزرگ تھے، ان کا انداز گفتگو بڑا پیارا تھا، سننے والے کا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتے رہیں اور سننے والا سنتا رہے، عمر بن اسحاقؒ راوی کا بیان ہے کہ

ما تکلم عندی احد کان الی اذا تکلم ان لا یسکت من الحسن بن علیؓ. میرے سامنے بات کرنے والوں میں حضرت حسنؓ کا انداز گفتگو اتنا پیارا تھا کہ میں چاہتا تھا کہ وہ خاموش نہ ہوں۔

اس کے بعد عمر ابن اسحاقؒ نے کہا ہے، میں نے آپ کی زبان سے کوئی فحش بات نہیں سنی، صرف ایک بار ایک شخص سے اور ان سے زمین کا جھگڑا چل رہا تھا تو غصہ میں اتنا کہا اس شخص کو ہمارے سامنے ناک رگڑنا پڑے گا، یہی سب سے سخت اور نامناسب لفظ میں نے حضرت حسنؓ کی زبان سے سنا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی)

حضرت حسنؓ کی یہی بھاری بھر کم حیثیت اور ان کی باوقار شخصیت تھی، جس نے بڑے نازک حالات میں حلم وصبر اور وقار وسکینہ سے کام لے کر امت محمدیہ کو ایک بڑے ہی خطرناک فتنہ سے بچایا اور حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں صلح وآشتی کا رویہ اختیار کیا، واقعی حلم وحیا اور حشمت وقار شخصی کے اوصاف پوری قوم کے لئے باعث عز ووقار ہوتے ہیں اور ایسی ذات سے دنیا کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

ایمان کے تین عوامی تقاضے:

(۱) کھانا کھلانا ایمان میں سے ہے۔

(۲) اسلام پھیلانا ایمان میں سے ہے۔

(۳) راستہ سے تکلیف دور کرنا ایمان میں سے ہے۔

یہ تینوں کام جن کو ایمان کا تقاضا اور مومن کی خصلت میں شمار کیا گیا ہے، ان کا تعلق براہ راست ایمان کی علامت اور مومن کی عادت ہے اور اللہ ورسول اور آخرت پر ایمان لانے کے نتیجہ میں یہ اوصاف مومن کے اندر پیدا ہوتے ہیں، بالفاظ دیگر ایمان کی علامت میں یہ باتیں داخل ہیں، اپنے بھائی کی روٹی کا انتظام کرنا اور اس کی بھوک دور کرنا اور اپنے بھائی کو امن وسلامتی کا پیغام دینا اور یقین دہانی کرانا کہ وہ ہماری طرف سے بے خوف وخطر رہے اور چلنے پھرنے والوں کو آرام پہنچانا؛ حتی کہ راستہ میں ایسی گری پڑی چیزوں کو ہٹا دینا جن سے ٹھوکر لگنے، گر جانے، زخم آنے یا جان ومال کا خطرہ ہو۔

سوچو کہ ایمان دنیا کے لئے کس قدر راحت وآرام کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور مومن کو اس سلسلہ میں کس قدر ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

جوارِ حرم کی عظمت اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

مدرسہ کی مسجد (مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ) تاریخی حیثیت کے علاوہ ہندوستانی طرز تعمیر کا واحد نمونہ ہے، صحن حرم میں زمزم کے قریب ''سلطانی کتب خانہ'' کی عمارت تھی، صحن حرم میں اس عمارت کی وجہ سے نماز کے اوقات میں حجاج کو خاص طور پر تکلیف اور زحمت ہوتی تھی، حجاز کے گورنر عثمان نوری پاشا نے وزارت اوقاف قسطنطنیہ کو اس طرف توجہ دلائی کہ کتب خانہ کی عمارت اگر صحن حرم سے اٹھا دی جائے تو زائرین اور حجاج کی آسانی اور سہولت کا باعث ہوگا، یہ درخواست سلطان عبدالحمید مرحوم کے حضور میں منظور ہوئی، کتابیں اور عمارت کا تمام سامان مسجد حرم سے ایک ملحقہ عمارت میں منتقل کیا گیا اور کتب خانہ کی عمارت گرا دی گئی، منہدم عمارت کے سامان وغیرہ کے نیلام کا اعلان ہوا، اس خبر کو سن کر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ بے چین ہوئے، کہ جو پتھر اور سامانِ عمارت جوار کعبہ اور صحن حرم میں رہا ہو نیلام کے بعد نہ معلوم کس جگہ اور کس مقام پر خریدنے والے استعمال کریں، حضرت مولانا مرحوم نے عثمان نوری پاشا سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس سامان سے مدرسہ صولتیہ سے متعلق ایک مسجد بنوادی جائے، جس کی ضرورت بھی ہے، اس تجویز سے حجاز کے گورنر نے اتفاق ظاہر کیا، ملبہ کی قیمت پندرہ سو روپے طے ہوئی اور یہ صحن حرم سے مدرسہ میں منتقل ہوا۔ ۱۳۰۱ھ میں اس یادگار زمانہ مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، مکہ مکرمہ کے معمار گنبدوں کے بنانے میں مہارت نہیں رکھتے تھے، مسجد کے تینوں گنبد پانی پت کے کرنال کے معماروں کی یادگار ہیں جو اس زمانہ میں فریضۂ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظمہ آئے تھے، مسجد کی عمارت ۱۳۰۲ھ میں مکمل ہوئی، ہرات کے ایک ذی علم اور خوش قلم و خوش کلام مہاجر جن کو حضرت مولانا مرحوم سے خلوص اور دلی تعلق تھا انہوں نے مسجد کا

مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھ کر اپنے ہاتھ سے محراب کی پیشانی پر کندہ کیا:

بسکہ خوش منظر است ایں مسجد ☆ ما رائی العین مثلہ الثانی

گشت تاریخ ''خانۂ رحمت'' (۱۳۰۴) ☆ رحمۃ اللہ قل علی البانی

ماہنامہ ذکر وفکر دہلی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی نمبر/۹۲

مولانا شوکت علیؒ

اچھا پہننے کا شوق تو کھدر کے رواج نے خاک میں ملا دیا تھا، کھلے کھلے سے جھابڑ جھلا سے کپڑے پہنتے تھے اور گلے میں ایک تھیلا "تھیلا خلافت" لٹکائے رہتے تھے، جس میں کچھ خطوط، کچھ پمفلیٹ اور خدا جانے کیا الا بلا بھری رہتی تھی۔ البتہ سر پر سمور کی ٹوپی ضرور اوڑھتے جس پر ایک بڑا سا ہلال کڑھا ہوتا تھا۔ بعد میں وہ ٹوپی بھی کھدر کی ہوگئی تھی؛ لیکن علی برادران کی انفرادیت لباس میں بہر حال نمایاں رہی، دونوں بھائیوں نے گاندھی ٹوپی ایک دن بھی پہن کر نہ دیکھی، کیوں کہ وہ ان کے ذوق کو پسند آ ہی نہیں سکتی تھی، اچھا کھانے کا شوق ہمیشہ رہا؟ نوعیت اور مقدار دونوں اعتبار سے خوب کھاتے تھے؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ لذت کام و دہن کے غلام تھے ایک دن مدراس میں سیٹھ جمال کے یہاں دعوت تھی، بیسیوں قسم کے کھانے موجود تھے، مولانا ہر کھانے پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے اور ساتھ ہی کہتے جاتے تھے کہ جو خدا ایسے لذیذ کھانے کھلاتا ہے اگر اس کی خاطر کبھی سوکھی روٹی بھی کھانی پڑے گی تو اسی شوق ذوق سے کھاؤں گا۔

تحریک خلافت کے زمانہ کے بعد ہمارے ملک میں اکثر سیاسی لیڈر سب سے پہلے اپنی مادی و مالی حالت کو درست کرنے کی فکر میں مصروف ہوگئے اور اب تک یہی مذاق عام ہے؛ لیکن مولانا شوکت علیؒ اور مولنا محمد علیؒ نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا، رام پور

میں خاصی جائیداد تھی وہ بھی خالصے لگ گئی اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو مال کے نام سے تو کچھ نہ چھوڑا، البتہ خدا و خلق کے نزدیک اپنی ساکھ کو اس قدر بلند کر گئے کہ اس کا مقابلہ آج تک کسی لیڈر سے نہ ہو سکا۔

یاران کہن ۲۶/ ۔عبدالمجید سالک

مولوی سید ممتاز علیؒ

(۱)

مولوی سید ممتاز علی ۱۸۶۲ء میں سید ذوالفقار علی کے ہاں پیدا ہوئے، مقام ولادت راولپنڈی ہے، حضرت امام رضاؑ کے اولاد و احفاد میں سے ایک خاندان غالباً عہد عالمگیری میں بخارا سے ہندوستان میں وارد ہوا اور جگادھری ضلع انبالہ کے قریب آباد ہو گیا، دو تین نسلیں وہیں مقیم رہیں، آخر ایک بزرگ میر ہاشم علی دیوبند میں جا کر آباد ہو گئے۔

(۲)

مسائل نسواں میں مولوی صاحب کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیواؤں کے نکاح ثانی اور پردے کے متعلق رضامندی کو شرط قرار دیتے تھے: اگر بیوہ رضامند ہو تو اس کا نکاح ثانی کیا جائے ورنہ نہیں: اگر کوئی عورت پردہ اٹھانا چاہے تو وہ مختار ہے اور اگر ترک کرنا چاہے جب بھی اسے روکنا درست نہیں، ایک دفعہ میں نے کسی مضمون میں ''آزادی نسواں'' کی ترکیب لکھ دی تو کہا: میاں سالک! آزادی نسواں کی جگہ حریت نسواں لکھا کرو، ''حریت'' ایک دینی اصطلاح ہے جس کا مقصود ہے بعض بنیادی حقوق، جو دین نے عورت کو دیئے ہیں، آزادی کا لفظ غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔

(۳)

مولوی صاحب نے لڑکیوں کے لئے ''تہذیب نسواں'' جاری کیا اور اپنی بعض عزیزات سے اس میں مضامین لکھوائے تو اس تاریکی اور جہالت کے زمانے میں ہر طرف شور مچ گیا اور مولوی صاحب کے نام گالیوں سے بھرے خطوط آنے لگے، یہاں تک کہ جب مولوی صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''حقوق نسواں'' لکھی تو اس کا مسودہ لے کر سرسیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ذرا ان کو بھی دکھلا لیں، سرسید اس مسودے کو جستہ جستہ مقامات سے دیکھنے لگے؛ لیکن مولوی صاحب نے دیکھا کہ غصہ سے سرسید کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا ہے، آخر سرسید نے اس مسودے کو چاک کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور کہا: ممتاز علی! ہماری حکومت چھن گئی، ہماری تہذیب مٹ گئی، اب کیا ہماری عورتیں بھی ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گی؟ مولوی صاحب نے بہتیرا کہا کہ میں نے اس کتاب کی تحریر میں شریعت مقدسہ کے حدود سے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا ہے؛ لیکن سرسید کا مزاج ذرا بھی رو براہ نہ ہوا اور مولوی صاحب ناچار اپنے مسودے کے ٹکڑے ردی کی ٹوکری میں سے اٹھا کر چلے آئے، آج اس کتاب کو پڑھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس میں وہ کون سی بات تھی جس نے سرسید جیسے روشن خیال اور تجدد پسند شخص کو بھی چراغ پا کر دیا۔

(۴)

مولوی صاحب کے بڑے صاحب زادے سید حمید علی لڑکپن ہی میں بیمار ہو گئے تھے بہت علاج کیے گئے؛ لیکن سات سال گزر گئے آخر اس مرض کا ازالہ تو ہوا؛ لیکن ایک ٹانگ دوسری سے کسی قدر چھوٹی ہو گئی، حمید علی کی اس طویل علالت کے دوران میں مولوی صاحب اکثر ان کے بستر کے پاس بیٹھے ہوئے قرآن پڑھتے رہتے تھے ان دنوں یہ خیال

آیا کہ قرآن مجید میں مختلف مطالب کی آیات تلاش کرنے میں ہر شخص کو دقت ہوتی ہے اس لئے قرآن کا ایک انڈیکس تیار کرنا چاہئے یہ خیال آتے ہی مولوی صاحب نے مطالب آیات کی ایک جامع مانع فہرست تیار کی اور اس کے بعد قینچی لیکر آیات کو کتر کتر کر بڑے بڑے کاغذی تختوں پر چپکاتے گئے، کئی سال کی محنت کے بعد پورے قرآن کا انڈیکس مکمل ہو گیا۔

اب یہ بے نظیر کتاب ''تفصیل البیان مطالب آیات القرآن'' کے نام سے چھپ چکی ہے، آپ چاہیں شرع، اخلاق، اصول دین غرض کسی مسئلے کے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات یکجا مل جائیں تو تفصیل البیان سے یہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک دفعہ سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور علوبہ پاشا لاہور آئے مولوی سید ممتاز علی نے ان کو چائے کی دعوت دی اور تفصیل البیان دکھائی، مفتی اعظم نے اس کتاب کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ ایسی کتاب عرب دنیا میں موجود نہیں، نجوم الفرقان، فتح الرحمان وغیرہ موجود ہیں، جن کا فایدہ صرف اس قدر ہے کہ ایک لفظ بھی یاد ہو تو آیات کا اتا پتا مل جاتا ہے، لیکن مسائل کی فہرست اور پھر ہر مسئلے کے متعلق تمام آیات کی یکجائی یہ خوبی عربی زبان کی کسی کتاب میں موجود نہیں، اس کتاب کو عربی میں بھی چھاپنا چاہئے۔

یاران کہن/۵۸-۶۰-۶۵/عبدالمجید سالک

مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس زمانہ میں ابوالکلام آزاد بھی بے ریش و بروت انسان تھے اور نوعمری کے باوجود علم و فضل اور لسانی وطراری کے اعتبار سے اپنے ہمسروں اور ہم عصروں سے کوسوں آگے تھے، بمبئی میں آغا حشر، ابونصر آہ اور نظیر حسن سخا کے ساتھ عیسائیوں اور آریوں سے

مناظرہ کیا کرتے تھے اور اپنے اہتمام سے ایک ماہانہ رسالہ ''بلاغ'' بھی نکالتے تھے، مناظروں کے سلسلہ میں انہیں مرزا غلام احمد قادیانی کی بعض ایسی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا جن میں عیسائیوں اور آریوں کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کی گئی تھی، یاروں کا یہ مجمع تو ایک دفع فیصلہ ہی کر چکا تھا کہ پنجاب جائیں اور مرزا صاحب سے ملیں؛ لیکن اتفاقات زمانہ کی وجہ سے یہ فیصلہ عمل میں نہ آسکا، بہرحال مولانا ابوالکلام مرزا صاحب کے دعوائے مسیحیت موعود سے تو کوئی سروکار نہ رکھتے تھے لیکن ان کی غیرت اسلامی اور حمیت دینی کے قدردان ضرور تھے، یہی وجہ ہے کہ جن دنوں مولانا امرتسر کے اخبار ''وکیل'' کی ادارت کر مامور تھے اور مرزا صاحب کا انتقال انہی دنوں ہوا تو مولانا نے مرزا صاحب کی خدمات اسلامی پر ایک شاندار شذرہ لکھا امرتسر سے لاہور آئے یہاں سے مرزا صاحب کے جنازہ کے ساتھ بٹالہ تک گئے۔

مولانا شبلیؒ نوعمر ابوالکلام آزادؒ کی علمیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ''الندوہ'' کی ادارت انہیں کو سونپ دی، مولانا کی نوعمری کی وجہ سے اکثر بزرگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ جو فاضل ''الندوہ'' میں مضامین لکھتا ہے وہ یہی لڑکا ہے؛ بلکہ مولانا حالیؒ تو ایک دفعہ مولانا ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام آزاد کا صاحبزادہ سمجھ بیٹھے تھے اور بعد میں بیحد حیرت اور ندامت کا اظہار کیا۔

وضعداری

مولانا کی پابندی وضع اور متانت ملک بھر میں مسلم ہے، غذا اور لباس نشست و برخاست، تعلقات وروابط، انداز اظہار کی شائستگی، سخن طرازی وبذلہ سنجی جو پہلے دن تھی وہی اب تک قائم ہے اور اس اعتبار سے وہ برصغیر پاک وہند میں غالباً کوئی مثال نہیں رکھتے۔

صاف ستھری، لطیف اور قلیل غذا کھاتے ہیں، گوشت ہو یا سبزی یا دال جب تک صفائی اور نظافت محفوظ ہے مولانا کو ہر شئی پسند ہے اور اگر غذا کے کسی جز میں بھاری پن یا تکلف نظر آئے تو مولانا اس کو ہاتھ تک نہ لگائیں اور روٹی کے چند نوالے کھا کر دستر خوان سے اٹھ جائیں گے، میٹھا پسند نہیں، نمک پسند ہے، اعلیٰ درجہ کی چینی چائے پیتے ہیں جس میں دودھ ڈالنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔

ایک علمی حقیقت

کوئی بھی علمی بات کریں گے تو اس کو اپنی خوش بیانی سے اتنا دلکش بنادیں گے کہ عمر بھر بھلائی نہ جاسکے، پاکستان کے قیام سے پہلے ایک دن سید احمد شاہ بخاری کے ہاں کھانے پر آئے، مسلمانوں میں روح عمل کے فقدان پر بات ہو رہی تھی، فرمایا تصوف کی کتابیں اور اولیاء کے تذکرے پڑھو۔ تو اس قسم کے واقعات اکثر نظر آئیں گے کہ ایک بزرگ محفل سماع میں بیٹھے تھے مطرب نے شعر پڑھا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

حضرت نے سن کر نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے، حضرت بایزید بسطامیؒ بازار میں جارہے تھے، شام کا وقت تھا ایک امرود فروش کی ٹوکری میں صرف ایک امرود باقی رہ گیا تھا اور وہ اس کو اٹھا کر صدا لگا رہا تھا، لم یبقی الا الواحد. لم یبقی الا الواحد. حضرت بایزید بسطامیؒ نے نعرہ مارا اور بے ہوش گئے، حضرت فلاں رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رنڈی کو تائب ہونے کی تلقین کی، اس نے شعر پڑھا۔

در کوئے نیکنامی مارا گزر ندادند

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضارا

حضرت نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔

پھر مولانا نے فرمایا ایک زمانہ تھا کہ مسلمان نعرہ مارتا تھا تو دشمن بیہوش ہو جاتے تھے، پھر ایسا زمانہ آیا کہ مسلمان خود ہی بے ہوش ہو جاتا تھا۔

یارانِ کہن ۴۱/۵۱-۵۳/عبدالمجید سالک

سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

(۱)

۱۹۴۱ء میں تعلیم ختم کر کے لاہور سے اعظم گڈھ واپس آرہا تھا، ٹرین میں چند سفید پوش حضرات خوش گپی کر رہے تھے؛ مگر ان کا انداز بحث جیسا ہو گیا تھا، اس میں موضوع بحث تھی اردو زبان اور بحث کرنے والے دونوں ادیب تھے، ایک نے دوسرے کو جواب دیتے ہوئے برجستہ کہا اور کہا کہ وہ فقرہ ذہن میں سما کر رقص کرنے گا، کہنے لگا کہ:

''جناب! اردو دہلی میں پیدا ہوئی، لکھنؤ میں جوان ہوئی اور دارالمصنفین میں بیاہی گئی''۔

اس مبالغہ سے مجھے حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی کہ لاہور اور اس کے ادیب دارالمصنفین کتنی اہمیت دیتے ہیں، اور انہوں نے علامہ شبلی کی اس تعمیری خدمت کو کس قدر تحسین دی ہے، نیز علامہؒ نے اردو زبان کو علمی لب ولہجہ دے کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ کیسا عجیب کارنامہ ہے اور کتنی دور سے نظر آتا ہے۔

(۲)

اب نومبر ۱۹۸۷ء کے تیسرے ہفتہ میں جب صباح الدین عبدالرحمٰنؒ صاحب کا

لکھنؤ میں حادثہ پیش آیا تو مجھے وہ دارالمصنفین بیت یاد آیا، بہت یاد آیا؛ کیوں کہ مرحوم ہی اس کی آبرو تھے، مرحوم کا تاریخی ذہن، تحقیقی مزاج اور علمی سلیقہ انہیں ہر محفل میں ممتاز کر دیتا تھا اور لوگ محسوس کرنے لگتے تھے کہ یہ مشت پر، بلبل ہزار داستان ہے، افسوس وہ مرغ خوش الحان ہمیشہ کے لئے باغ قدس کی طرف اڑ گیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

صباح الدین صاحب بہار میں پیدا ہوئے، ڈالی گنج لکھنؤ میں وفات پائی، اعظم گڈھ میں پیوند خاک بنائے گئے؛ مگر ان میں کوئی بات اتفاقی نہیں تھی، انتظامی تھی، وہ اتنی ہی مہلت لے کر آئے تھے، جو ڈالی گنج جاتے جاتے پوری ہوگئی اور گھڑی کی چابی جہاں بھی ختم ہو جاتی ہے وہیں رک جاتی ہے، اس طرح عمر جہاں پوری ہوگئی، پھر آدمی ایک قدم آگے پیچھے نہیں ہوسکتا، مجھے خوشی اس کی ہے کہ مرحوم سفر آخرت پر گئے تو شہادت کا سنہرا تمغہ لے کر خدا کے دربار میں حاضر ہوئے جو انسانی عظمت کا ترین تمغہ ہے، جس کی لوگ آرزو کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور نہیں ملتا؛ مگر انہیں اللہ کی حکمت وقدرت نے تحفہ میں عنایت کر دیا۔ رحمہ اللہ تعالی۔

بزم کہن تذکرے اور خاکے ر مولانا افضال الحق جوہرؒ

ہماری نثر بھی آپ نے دیکھ لی

ڈپٹی نذیر احمدؒ

عبدالمجید سالک اپنی کتاب ''سرگزشت'' میں ایک جلسہ کا دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں۔

خواجہ دل محمد صاحب انیس بیس سال کے جوان تھے اور اسی سال انہوں نے ریاضی میں ایم اے کر کے برادران وطن کے اس طعنہ کا موثر جواب دیا تھا کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا، خواجہ صاحب کی ایک خصوصیت خاص طور پر حیرت انگیز تھی کہ وہ ریاضی جیسے خشک مضمون کے ساتھ ہی ساتھ بحر شاعری کے بھی شناور تھے، اس سال انہوں نے ایک پاکیزہ مسدس ''کلک گہر بار'' کے نام سے پڑھی، جس پر بہت پر شور داد ملی، اور انجمن کو چندہ بھی خوب ملا، اس اجلاس میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد بھی دہلی سے آئے ہوئے تھے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، چہرے پر تعبس، سفید داڑھی، لمبا سیاہ چغہ جو غالباً ایل ایل ڈی کا گاؤن تھا، آپ نے تقریر شروع کی تو دلآویز انداز بیان کی وجہ سے سارا جلسہ ہمہ تن گوش ہو گیا، آپ نے فرمایا: خواجہ دل محمد بہت ذہین اور لائق نوجوان ہیں اور شاعری فی نفسہ بری چیز نہیں، حسان ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر تھے: لیکن میں کہتا ہوں کہ جو دماغ کہ زیادہ عملی علوم کے لئے موزوں ہے اسے شعر کے بے کار شغل میں کیوں ضائع کیا جائے، اس پر حاجی شمس الدین اٹھے اور کہا کہ شعر چونکہ مسلمہ طور پر نثر سے زیادہ قلوب پر اثر کرتا ہے اس لئے یہ بھی مقاصد قومی کے حصول کے لئے مفید ہے، چنانچہ خواجہ صاحب کی نظم پر انجمن کو اتنے ہزار روپیہ چندہ وصول ہوا جو دوسری صورت میں شاید نہ ہوتا۔

اس پر مولانا ڈپٹی نذیر احمد کسی قدر تاؤ کھا گئے اور کہنے لگے حاجی صاحب چندہ جمع کرنا کوئی بڑی بات نہیں، جو شخص خدمت میں ثابت قدم رہتا ہے اس کی بات قوم پر ضرور اثر کرتی ہے، یہ کہا اور عجیب دردناک انداز سے اپنی چوگوشیہ ٹوپی اتاری اور فرمایا یہ ٹوپی جو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے سامنے بھی نہیں اتری، محض اس غرض سے اتارے دیتا ہوں کہ اس کو کاسۂ گدائی بنا کر قوم سے انجمن کے لئے چندہ جمع کیا جائے، فقیر آپ کے سامنے

موجود ہے، کشکول اس کے ہاتھ میں ہے، دے دو بابا تمہارا بھلا ہوگا۔

بس پھر کیا تھا جلسے میں بے نظیر جوش پیدا ہوگیا، مولانا کی ٹوپی مولانا کے سر پر رکھے گئی اور ہر طرف سے روپیہ برسنے لگا، یہاں تک کہ حاجی شمس الدین کی آواز اعلان کرتے کرتے بیٹھ گئی اور جب ذرا جوش کم ہوا تو مولانا نے پھر تقریر شروع کی اور ہنس کر حاجی صاحب سے کہا: اس نظم کے بعد ہماری نثر بھی آپ نے دیکھ لی۔

مولانا احمد سعید دہلویؒ

(۱)

۱۹۲۲ء کے اواخر میں جب میں مدیر ''زمیندار'' کی حیثیت سے تحریک خلافت میں سزایاب ہوکر میانوالی جیل میں پہنچا تو چند ہی روز میں معلوم ہوگیا کہ مولانا احمد سعید دہلویؒ جمعیۃ العلماء ہند بھی اسی جیل کے کسی دوسرے حصہ میں موجود ہیں، وارڈروب سے کرید کرید کر پوچھا تو انکشاف ہوا کہ مولانا قیدیوں کے لباس میں ہیں اور مونج بٹنے کی مشقت کررہے ہیں۔ یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔

(۲)

جیل کی دنیا عجیب دنیا ہے وہاں قیدیوں کو بیرونی دنیا کے واقعات وحوادث کا بہت کم علم ہوتا ہے، خصوصاً عام اخلاقی قیدی تو اپنی جہالت کی وجہ سے بالکل ہی بے خبر ہوتے ہیں، قیدیوں کی دو قسمیں ہیں، ''ایکبارہ'' اور ''دوبارہ'' ایکبارہ قیدی جسے پہلی بار جیل جانے کا اتفاق ہوا ہو، دوبارہ وہ جو عادی مجرم ہو اور ایک سے زیادہ بار قید ہوچکا ہو، مولانا نے لطیفہ سنایا کہ جب میں نیا نیا میانوالی جیل میں آیا تھا، تو ایک پرانے اور طویل المیعاد قیدی نے مجھے نماز اور تلاوت میں مصروف دیکھ کر سمجھ لیا کہ مولوی ہوں، ایک دن اس

نے پوچھا، مولبی جی! تم نے کا جرم کیا تھا، کہ بندھ گئے؟ میں نے کہا: بھئی ہم تو تحریک خلافت میں سزایاب ہوکر آئے ہیں، قیدی کچھ نہ سمجھا، پھر میں نے اس کو ترک موالات، عدم تعاون اور خدا جانے کس کس لفظ اور اصطلاح کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی، نتیجہ صفر، میں نے پوچھا گاندھی کو جانتے ہو؟ کہنے لگا ہاں، ہمارے گاؤں میں ایک گاندھی ہے جو شادی کے موقع پر ہر عطر لگایا کرتا ہے (یعنی گندھ)، آخر میں نے عاجز آکر کہا خلیفۃ المسلمین کو جانتے ہو؟ قیدی نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا کہ وہ ایکبارہ ہے کہ دوبارہ؟ میں بے اختیار ہنس دیا اور تفہیم کی کوشش سے دست بردار ہو گیا۔

(۳)

مولانا سے اکثر دینی مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے اور وہ اپنے علم وفضل اور بیان کے سلجھاؤ کی وجہ سے دقیق سے دقیق چیز کو بآسانی سننے والوں کے ذہن نشین کر دیتے، ایک دفعہ داڑھی کے سلسلے میں بات چیت ہوئی، مولانا نے اپنا مسلک واضح کیا اور حدیث رسول ''قصوا الشوارب واعفوا اللحی'' کو دلیل میں پیش کیا؛ لیکن اس کے ساتھ ہی فرمانے لگے کہ دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماء اس معاملے میں اتنے شدید و متشدد نہیں ہیں، جتنے ہمارے علماء ہیں، پھر فرمایا: میں چند ماہ پیشتر مصر گیا تھا، وہاں مجھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا، نماز کے لئے ایک مسجد میں گیا، ابھی وضو کر ہی رہا تھا کہ محسوس کیا کہ بعض لوگ بڑے غور سے مجھے گھور رہے ہیں، سوچا کہ غیر ملکی ہوں گے۔ اس لئے دیکھ رہے ہوں گے؛ لیکن ایک دو منٹ کے بعد ہی ایک پوچھ بیٹھا، أ انت یھودی؟ میں نے جواب دیا، لا واللہ انا مسلم الحمدللہ۔ پھر اس نے کہا کہ تمہاری پھیلی ہوئی اور غیر مرتب داڑھی بالکل یہودیوں کی سی ہے، یہ درست نہیں، من تشبہ بقوم فھو منھم، قرآن مجید

کہتا ہے کہ جو شخص کسی قوم سے تشبہ پیدا کرتا ہے، وہ اسی قوم میں سے ہے، میں یہ سن کر بے حد پریشان ہوا کہ ہم تو ہندوستان میں داڑھی منڈانے والوں کو یہ سنایا کرتے ہیں، یہاں یہی آیت الٹا ہماری داڑھیوں پر منطبق ہو رہی ہے۔

نماز پڑھنے کے بعد میں سیدھا جامعہ ازہر چلا گیا؛ کیوں کہ شیخ الازہر سے ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا، جامعہ کے اندر جا کر جس کمرے میں جھانکتا ہوں یہی نظر آتا ہے کہ ایک فرینچ کٹ یا خشخشی داڑھی والے معلم طلبہ کے سامنے کھڑے ہیں اور حدیث بخاری پر لیکچر دے رہے ہیں، ایک قریب قریب داڑھی منڈا آدمی فقہ حنفی کے غوامض ونکات نہایت فصیح وبلیغ عربی زبان میں بیان کر رہا ہے، خیر، جب میں رہبر کی مدد سے شیخ الازہر کے فیشنیبل ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ان کے چہرے پر میں نے پوری داڑھی دیکھی، علیک سلیک کے بعد پہلے تو مسئلہ خلافت اور سیاسیات عالم اسلامی پر گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد میں نے پوچھا، حضرت داڑھی کے متعلق آپ لوگوں کا مسلک کیا ہے؟ میں نے تو یہاں آکر دیکھا کہ رسول اللہ کی سنت پر بہت ہی کم عمل ہوتا ہے اور خود علما بھی اس کے تارک ہیں۔

شیخ الازہر مسکرائے اور کہا: ہندوستان میں لوگ اس قسم کے غیر اہم مسائل پر تضیع اوقات کرتے ہیں؛ حالانکہ اوضاع ظاہری کا معاملہ امور شرعیہ میں شامل نہیں، میں نے گذارش کی کہ آپ بھی تو فقہ حنفی پر عامل ہیں، اصول فقہ میں ہے، الامر للوجوب، خدا اور رسول نے جن امور کا حکم دیا ہے اس کی تعمیل واجب ہے، شیخ نے فرمایا: ہر کلیہ کا استثناء ہوتا ہے، ہمارے نزدیک اوضاع ظاہری میں یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے، ہم اس کو استحباب کا درجہ دیتے ہیں؛ اگر کوئی مسلمان بہ نیت اتباع رسول داڑھی رکھتا ہے تو اس کو یقیناً ثواب ہوگا؛ اگر منڈاتا یا ترشواتا ہے تو اس پر کوئی عذاب نہ ہوگا، میں خود حکم رسول کی تعمیل میں

داڑھی رکھتا ہوں اور ثواب کا متوقع ہوں، میرے رفقا نہیں رکھتے، میں انہیں نہ گمراہ سمجھتا ہوں نہ مستوجب عذاب خیال کرتا ہوں۔

یاران کہن ر ۱۵۷۔ ۱۵۹۔ ۱۶۱

مولانا غلام قادر گرامیؒ

(۱)

مولانا گرامی جالندھر کے رہنے والے تھے، ککّے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے، انہیں مبداء فیاض سے فارسی شاعری میں وہ کمال حاصل ہوا کہ عرفی و نظیری کی یاد تازہ ہوگئی، میر محبوب علی خان نظام دکن کی نظرِ انتخاب نے ان کو اپنے دربار کے لئے منتخب کرلیا، چنانچہ آپ شاعرِ دربار اور استاذ نظام کی حیثیت سے حیدرآباد دکن چلے گئے، پرانی وضع کے بزرگ تھے، حیدرآبادی شیروانی اور آڑا پاجامہ پہنتے، سر پر بڑی سی رنگین دستار باندھتے، بھری بھری داڑھی، موٹے موٹے خدوخال، چمکتی آنکھیں، بے حد ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج، ڈاکٹر اقبالؒ سے خصوصی دوستانہ تعلق تھے، کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب اپنے فارسی اشعار کے بارے میں مشورہ بھی کرلیا کرتے تھے اور ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ اجلاس میں گرامی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا، کہ اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو وہ گرامی ہے، آج گرامی کو سن لو، کل فخر کروگے تم نے گرامی کو سنا ہے اور مولانا گرامی کے دل میں بھی ڈاکٹر صاحب کی قدر و وقعت کم نہ تھی۔

(۲)

گرامی کی طبیعت میں ایک خصوصیت ایسی تھی، جو میں نے عمر بھر کسی شخص میں نہیں پائی، یعنی شعر میں ایسا انہماک تھا کہ باقی امور سے انقطاع کلی ہوگیا تھا: اگر جالندھر سے

چل کر لاہور پہنچنا ہے تو کوئی ٹرین میں بٹھا دے اور کوئی لاہور پہنچ کر اتار لے اور نہ انہیں بالکل احساس نہ ہوگا کہ انہیں کہاں اترنا ہے، ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے گرامی شعروں میں تلمیذ روح الامین ہیں اور باقی تمام معاملات میں چغد ہیں۔

(۳)

ایک دفعہ کا ذکر ہے علی بخش گیا اور ڈاکٹر صاحب کی طرف سے سلام و پیام دے کر کہنے لگا: مولانا آپ کل صبح میرے ساتھ چلے چلئے، کہنے لگے، ہاں ہاں ضرور چلیں گے، کیوں نہ چلیں گے، ڈاکٹر! ڈاکٹر کی "ٹ" کو ہمیشہ "ت" سے بدل دیا کرتے تھے، ہمارا دوست ہے دوست کے یہاں کیوں نہ چلیں گے، دوسرا دن آیا، صبح ہی بستر بندھوایا جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، پھر خدا جانے کی من میں کیا آیا بستر کھلوادیا ارادہ ملتوی کر دیا، اب علی بخش جز بز ہو رہا ہے، اس کو سمجھا رہے ہیں کل چلیں گے تم فکر نہ کرو۔

تیسرا دن آیا، بستر پھر بندھ گیا، تانگہ منگا لیا گیا، تیاریاں مکمل ہو گئی، اندر گئے، باہر آئے، باہر گئے اندر آئے، بیگم سے کچھ باتیں کیں، کچھ ضروری چیزیں لے کر ٹرنک میں ٹھونسیں، کوئی گھنٹے بھر کے بعد باہر نکلے، گرمی کا موسم تھا، تانگے کی نشست تپ گئی تھی، علی بخش آگے کی نشست پر بیٹھ چکا تھا، مولانا پچھلی نشست پر بیٹھے ہی تھے کہ بے چین ہو کر اٹھے، ارے تانگہ بہت گرم ہے، یہ کہا اور نیچے اتر گئے، علی بخش سے بولے تم چلے جاؤ، ڈاکتر سے کہہ دینا تانگہ گرم ہو گیا تھا، اب سردیوں میں آئیں گے۔

(۴)

سردیوں کے موسم میں رات کے وقت انہیں محسوس ہوتا کہ سر کے نیچے تکیہ کافی اونچا نہیں، نیچے سے توشک نکال کر لپیٹتے اور سرہانے رکھ لیتے، پھر بھی طبیعت مطمئن نہ

ہوتی، لحاف کا گاؤ تکیہ بنا کر رکھ لیتے، اور پھر صبح کے وقت شکایت کرتے کہ ساری رات جاڑے میں مر گیا، تم لوگ کافی بستر کیوں نہ دیتے، علی بخش کہتا: کہ مولوی صاحب بستر تو دیا تھا؛ لیکن آپ نے کوہ ہمالیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا، اس پر اسے برا بھلا کہنے لگتے۔

(۵)

مولانا کا ایک نوکر تھا غلام محمد، بہت نمازی اور پرہیزگار، مکان کے پاس ہی مسجد تھی، غلام محمد نماز مسجد میں جا کر پڑھتا تھا، ایک دفعہ مولانا نے آواز دی، غلام محمد! کسی نے بتایا کہ ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہیں، دو گھنٹے گزر گئے پھر آواز دی، غلام محمد! پھر کسی نے بتایا کہ عصر کی نماز پڑھنے گیا ہے، بہت بگڑے، کہنے لگے، جب دیکھو، نماز پڑھنے گیا ہے، جب پوچھو نماز پڑھنے گیا ہے، نابکار، قرب مسجد کا ناجائز فایدہ اٹھاتا ہے، یہ ناجائز فایدہ بھی خوب رہا۔

سرگزشت

مولانا غلام قادر گرامیؔ کا نکاح ثانی

مولانا گرامی کے یہاں عمر بھر کوئی اولاد نہیں ہوئی، ایک دفعہ بعض عزیزوں نے کہا کہ آپ کی بیگم سے اولاد نہ ہوگی، آپ دوسرا نکاح کیجیے، پہلے تو نانا کرتے رہے، آخر راضی ہو گئے اور ایک عورت سے نکاح کر لیا، لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی تھی، اقبال بیگم (بیگم گرامی) کو بہت صدمہ ہوا، وہ لاہور آکر ڈاکٹر (علامہ اقبال) صاحب سے ملیں اور کہا، آپ انہیں سمجھایئے، اس بڑھوتی کے زمانے میں اسے کیا سوجھی، بیگم بے چاری بہت روتی تھیں، ڈاکٹر صاحب نے علی بخش کو بھیج کر مولانا کو بلوایا، دریافت حال کیا اور کہا: آپ نے برا کیا؛ اگر اقبال بیگم کے خلاف آپ کو شکایت ہوتی تو ایک بات بھی تھی، خواہ مخواہ بلا قصور اس پر سوتن لا بٹھائی، یہ کہاں کی انسانیت ہے؛ لیکن مولانا ہیں کہ پتھے پر ہاتھ نہیں دھرنے

دیتے، نکاح میں کیا حرج ہے، نکاح سنت رسول ہے، ملت کے بڑے بڑے لوگوں نے تین تین، چار چار نکاح کئے ہیں، میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی، میرے بعد میرا نام کون لے گا۔

ڈاکٹر صاحب اس بے زبان کی تر زبانی سے بہت پریشان ہوئے؛ لیکن آخر شاعر کو زیر کرنے کے لئے جذبات کے حربے سے کام لیا اور کہا کہ اولاد ہی سے نام نہیں رہتا، آپ کا کلام مدت دراز تک زندہ رہے گا اور لوگ آپ کو یاد رکھیں گے؛ لیکن جب روز قیامت آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگے گا اور ساری امت حضور کے قدموں میں جمع ہوگی اور اقبال بیگم حضور کا دامن تھام کر فریاد کرے گی، کہ اے دوجہاں کے آقا! میرا انصاف کرو، عمر بھر میں نے اس بڈھے کی خدمت کی لیکن اس نے بے قصور و بے گناہ مجھ پر سوکن لا بٹھائی اور میری زندگی کو تلخ کر دیا، اس وقت بڈھا گرامی کیا جواب دے گا؟ اے بوالہوس! کیا تم نے جواب سوچ لیا ہے؟

بس پھر کیا تھا، مولانا گرامی زار و زار رونے لگے، یا رسول اللہ! میں بھول گیا، میرے آقا! مجھ سے خطا ہوگئی، خدا کے لئے معاف کر۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر بتاؤ اب میں کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو تسلی دی اور کہا کہ فوراً واپس جا کر اس عورت کو طلاق دے دو اور حضور کے عتاب سے بچ جاؤ، مولانا گرامی نے جا کر اس عورت کو طلاق دے دیا اور آدھا مہر ادا کر دیا۔

سرگزشت ر ۶۷۔ عبدالمجید سالک

جرأت ایمانی

مولانا آزاد کے خطبہ صدارت اجلاس کانگریس (رام گڑھ) سے:۔

""میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی

تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کی تہذیب، اسلام کے علوم وفنون میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بہ حیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے؛ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔

مولانا کی دوسری برسی کی تقریب میں متعدد معاصروں نے مولانا کی تحریروں اور تقریروں کے بہت سے اقتباسات نقل کئے ہیں؛ لیکن ان بیسیوں اور پچاسویں عبارتوں سے اگر اور کوئی نہ ہوتی تو صرف یہ ایک ٹکڑا ہی مولانا کی عظمت کے لئے بس تھا، کانگریس کی کرسی صدارت سے یہ الفاظ نکالنے آسان نہ تھے، اسی جرات ایمانی کا ثبوت اگر مولانا محمد علیؒ اور حسرت موہانیؒ کے علاوہ کوئی دے سکتا تھا تو وہ مولانا ابوالکلام ہی تھے، کاش نیشنلسٹ مسلمانوں میں کچھ تھوڑے بہت بھی مولانا کے نمونے کے ہوتے۔

اردو کا ادیب اعظم/۷۹۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

(۱)

جمعہ 2 / جون 1916ء آج سے بڑھ کر مسرت کا دن زندگی بھر میں یاد نہیں پڑتا، ایک نشہ سا سوار تھا، خوشی سے اچھلا، ابلا پڑتا تھا، کوئی فاتح بڑے سے بڑا ملک فتح کر کے اس

سے زیادہ نازاں و مسرور کیا ہوگا، جتنا میں آج تھا!

سید سلیمان ندویؒ نے پہلے جب مجھے دیکھا کہ سر پر ریشمی زرق برق صافہ کے ساتھ فاتحانہ انداز میں محفل عقد کی طرف جا رہا ہوں تو کہا کہ ''غازی محمود سومنات فتح کرنے چلا ہے'' اور پھر تین رباعیاں بھی ارشاد فرمائیں۔ (اس وقت تک وہ کھل کر شاعری کے میدان میں نہیں آئے تھے) ان میں ایک یاد رہ گئی۔

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد
نوشاہ بنے ہیں آج عبدالماجد
وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد
بن جائیں جب وہ کسی کے والد ماجد

(۲)

مہر کی رقم اب کچھ نہ پوچھئے کیا تھی، میرے لکھنے سے بھی شاید کسی کو یقین نہ آئے، ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی ٹھہری اور لاکھوں بھی چاندی کے روپے (زر سفید) نہیں سونے کی اشرفیاں (زر سرخ) اس وقت خاندانی بڑائی ہم شریفوں میں یہی سمجھی جاتی تھی، کہ رقم مہر کی تعداد بس ایک فرضی و افسانوی حیثیت رکھے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو، جسٹس کرامت حسین مرحوم ایک ثقہ بزرگ میری مسند سے متصل بیٹھے تھے، وہ بیچارے ''ارے'' ''ارے'' یہ کیا غضب ہے، کہتے ہی رہ گئے، سب نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی اور میں میں نے دل ہی دل میں ''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز'' پڑھتے ہوئے اسے کھٹ سے منظور کر لیا، مہر کی شرعی اہمیت کسی درجہ میں بھی دل میں تھی ہی کب؟

۱۹۱۶ء جب ان سے عقد ہوا تو مجھ پر دور جاہلیت پوری طرح طاری تھا، مہر کی

شرعی حیثیت دور دور بھی دماغ میں نہ تھی، ایک فرضی اور تمام تر افسانوی رقم، روپیوں کی بھی نہیں، سونے کی اشرفیوں کی، مہر میں قبول کر لی، ادائی کا امکان اس رقم کا تو کیا، اس کی ہزارویں بلکہ دس ہزارویں حصہ کا بھی نہ تھا، برسوں گزر گئے یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء آ گیا اور اب حضرت تھانوی کی فیضِ صحبت سے پہلی بار سمجھ میں آیا کہ دین مہر بھی ہر دوسرے قرضہ کی طرح قرض واجب الادا ہے، اب گھبرا کر ایک دن تنہائی میں بیوی سے کہا، "یہ تو بڑی ہی بری بات ہوئی کہ اس بے اندازہ رقم کا اقرار بے سمجھے بوجھے کر لیا، خیر وہ تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب علاج صرف یہ ہے کہ جتنی بھی رقم میری حیثیت کے لحاظ سے تم میرے لئے ادا کرنا آسان سمجھو بے تکلف مجھ سے کہہ دو، میں کھٹ سے رقم ادا کر دوں گا؛ لیکن ہاں یہ بھی سمجھ لو کہ اگر میرے جبر یا دباؤ سے تم نے کوئی رقم چھوڑی، پھر معافی کیا ہوئی، جو رقم رکھو محض اپنی خوشی و مرضی سے رکھو اور جواب ابھی نہیں دو چار دن میں سوچ سمجھ کر دو"۔

اس نیک بخت نے جواب میں جو رقم بتائی اور کون یقین کرے گا لاکھوں سے گھٹ کر ہزاروں پر نہیں، سینکڑوں پر بھی نہیں، دہائیوں پر آ گئیں اور وہ بغیر کوئی تکلیف محسوس کئے (الحمدللہ) اسی وقت ادا کر دی گئی، سوچئے یہ احسان و ایثار کوئی معمولی ایثار رہا؟ اگر وہ ہزاروں پر اڑ جاتیں تو میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

آپ بیتی/۱۷۶-۱۷۷-۲۰۰/مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

صید الخاطر/ امام ابوالفرج کمال الدین ابن الجوزیؒ

ترجمہ: نفیس پھول

"صید الخاطر" ایک کشکول ہے، جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات، بے

تکلف خیالات، زندگی کے تجربات اور منتشر افکار وحوادث قلمبند کیے ہیں اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف اعتراف کیا ہے، اس کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال وجواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، نوکروں اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں اور مفید ہدایات، روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صدہا کام کی باتیں ہیں، اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے، پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم ومصنف کی پہلی کتاب ہے۔

نفیس پھول/۴۲ مقدمہ۔ مولانا علی میاں ندویؒ

مقام شکر

ایک مرتبہ ایسے معاملے میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش تھی، نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا، اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمادے اور قرآن مجید کی تلاوت شروع فرمادی، میرے درس کے سلسلہ میں سورہ یوسف شروع ہو رہی تھی، میں نے وہیں سے شروع کیا، وہ خیال دل پر مستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ کیوں پڑھا، جب اس آیت پر پہنچا ''قال معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای'' تو میں چونکا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے اور زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انہوں

نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا؛ حالانکہ نہ وہ غلام تھے نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ یہ بیان کی، کہ ''احسن مثوای ''مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کر، تو حقیقتاً غلام ہے ایسے آقا کا جو تیرے وجود کے وقت سے برابر تیرے ساتھ احسان کرتا رہا اور اتنے بار اس نے تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی شمار نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس نے تیری کس طرح پرورش کی، تجھے سکھایا پڑھایا، تجھے روزی دی، تیری حفاظت کی، خبر کے اسباب مہیا کئے، بہترین راستے پر تجھے ڈالا اور ہر مکروہ دشمنی سے تجھے بچایا اور حسن صورت ظاہری کے ساتھ باطنی ذکاوت وجودت طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ ان کی تعبیر کی قوت عطا فرمائی اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام وتکلف کے تجھ تک پہنچایا اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا اور وہ بھی فراغت واطمینان وکشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحت اعضاء کا یا سلامت مزاج یا اعتدال ترکیب کا یا لطافت طبع اور دنائت وابتذال سے بری ہونے کا یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستے کی توفیق کا، بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا یا منقولات کی ترجیح اور حدیث وسنت کی اتباع اور تقلید جامد سے نجات کا یا بدعت کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا ''**وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها**'' کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچھایا اور اللہ تعالی نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں نے تجھ کو سبک کرنا چاہا اور اس نے تجھے سربلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے

اور تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے اور تو شادکام اور فائز المرام ہے، اس حالت میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے اگر کوئی مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کردیا جاتا ہے اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پورا نہ ہونے ہی میں حکمت الٰہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا؛ اگر میں پچھلے احسانات کو گنوانا شروع کردوں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں اور وہ ختم ہوں اور تجھے معلوم ہو کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں اور جن کا ذکر میں نے کیا ہے ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا فعل کرنا کیسے زیب دیتا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، "معاذاللہ انه ربی احسن مثوای انه لا یفلح الظالمون"۔

نفیس پھول ترجمہ صید الخاطر رعلامہ ابن الجوزی ۲۶ر

ہندوستان کا مایہ ناز مسلمان

حکیم عبدالحمیدؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

ہندوستان کی آبادی سو کروڑ پہنچ رہی ہے؛ مگر انسانوں کے جنگل میں حکیم عبدالحمید کے قد کا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، جس نے 1947ء میں صفر سے کام شروع کیا؛ مگر آج وہ اٹھ کر گئے ہیں تو ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کو علم وفن، تجربہ ومہارت، تعلیم وتربیت، حوصلہ ولگن دے کر گئے ہیں اور ایسی ایسی علمی فنی تجرباتی اور معلوماتی یادگاریں، چلتی پھرتی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جو صدیوں ان کا نام، ان کا فن اور ان کی ولولہ انگیزیوں کو زندہ رکھیں گی۔

قبلہ حکیم صاحب ہماری دنیا میں ۱۹۱۸ء میں آگئے تھے؛ مگر نمایاں اس وقت

ہوئے جب ملک تقسیم ہوگیا؛ مگر حکیم عبدالحمید صاحب تقسیم نہیں ہوئے، ۱۹۴۷ء کا دہلی پنجاب کی طرح اجڑ گیا، قرول باغ کی طرح لٹ گیا اور سبزی منڈی کی طرح تہس نہس ہو گیا؛ مگر جو بچ گیا اس میں حکیم عبدالحمیدؒ صاحب بھی تھے، جو مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی طرح دہلی میں مرنا طے کر چکے تھے اور جینا بھی؛ مگر اس وقت انہیں دہلی میں کوئی نہ جانتا تھا؛ اگر جانتا تھا تو حفظ الرحمٰن جیسا جیالا جانتا تھا، جو پٹتے ہوئے مسلمانوں کو چھڑا کر اپنی گاڑی میں بیٹھا لیتا تھا، جس نے برستے خون اور دہکتی آگ میں مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو لے جا کر پناہ گاہوں میں پہنچایا تھا اور جب دہلی کے میر صاحب نے اس مرد مجاہد پر ترس کھا کر ان کو مشورہ دیا تھا، ''مولانا! خدا کے لئے آپ کسی پناہ گاہ میں آجایئے، سڑکوں پر نہ گھومئے، دہلی پاگل ہوگیا ہے؛ اگر کچھ ہوگیا تو ہم دنیا میں کہیں منہ نہ دکھا سکیں گے؛ مگر مولانا نے برجستہ جواب دیا تھا، ''حفظ الرحمٰن دہلی کی سڑکوں پر مرجانا پسند کرتا ہے؛ مگر اپنے وطن میں رفیوجی بن کر جینے کے لئے ایک منٹ بھی تیار نہیں''۔

مولانا نے للکار کر فرمایا کہ'' آپ اپنے شہر کی فکر کیجئے، حفظ الرحمٰن کی فکر نہ کیجئے اسے خدا پر چھوڑ دیجئے''۔

بزم کہن/ ۲۳۵

آبگینوں کو نرمی کے ساتھ لے کر چلو

رفقا بالقواریر۔ (آبگینوں کو نرمی کے ساتھ لے کر چلو)

'' انجشہ ایک حدی خواں کا نام تھا جو اونٹوں کا قافلہ لے کر جایا کرتا تھا اور اونٹوں کی تیز روی کیلئے مخصوص قسم کے ترانے کو'' لَے'' کے ساتھ گاتا بھی جاتا تھا جس سے اونٹ

تیزی کے ساتھ چلنے لگتے تھے، جب کہ اونٹوں پر ہودج ڈال کر خواتین سوار تھیں اس منظر کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رفقا بالقواریر۔ یعنی اونٹوں کو اتنی تیزی کے ساتھ مت بھگاؤ جس سے ان پر سوار عورتوں کو تکلیف ہونے لگے۔

حضرت براء بن مالکؓ کے بیان کے مطابق اونٹوں پر اسوقت خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سوار تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں عورتوں کو آبگینوں سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح آبگینے ٹوٹ جایا کرتے ہیں اسی طرح ان خواتین کو تکلیف ہوگی یا کم ازکم ان کے دلوں پر حدی خوانی کا اثر ہوگا، یا پھر تیز رفتاری کی وجہ سے گھبراہٹ طاری ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نہایت ہی موزوں اور بلیغ جملہ نے عربی زبان میں ایک محاورہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

مسلم معاشرہ میں خواتین کا علمی وادبی ذوق ۲۴۳/ مولانا بدرالحسن صاحب القاسمی

بقیع کا ایک واقعہ

(۱)

اس سلسلے کا ایک ارتسام ذہنی ایسا ہے جو مٹائے نہیں مٹتا، بقیع کی جنت کی سیر میں تنہا مصروف تھا کہ اچانک ایک سرخ وسپید چھریرے بدن والے نوجوان کالے سیاہ داڑھی سے بھرا ہوا، سامنے سے گزرتے ہوئے معلوم ہوئے، انہوں نے مجھے دیکھا، میں نے ان کو سلام کیا، سلام سے راہ ورسم کی ابتداء ہوئی دریافت سے معلوم ہوا کہ مراکش وطن ہے، مجھ سے پوچھا گیا تو کہاں کا ہے؟ ہند، جواب دیا گیا، اسی کے بعد واقعہ پیش آتا ہے، مراکشی نوجوان نے

عربی میں کہا کہ ہندوستان پر تو انگریزوں کی حکومت ہے، ہاں کہتے ہوئے فقیر نے عرض کیا کہ مراکش پر بھی تو فرانس قابض ہے، اس فقرے کے بعد پھر کیا ہوا؟ میں نے دیکھا کہ نوجوان مراکشی مجھ سے لپٹا ہوا ہے سامنے قبہ خضرا تھا اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلبلاتے اور چیختے ہوئے وہ کہہ رہے تھے یارسول اللہ! ان امتک فی الاسر فی اسر النصاریٰ. (یارسول اللہ آپ کی امت قید و بند میں گرفتار ہے نصاریٰ کی قید و بند میں) وہ بھی رو رہے تھے اور جس سے لپٹے ہوئے تھے وہ بھی رو رہا تھا، دونوں کی التجا کا رخ ایک ہی طرف تھا، مغرب اقصیٰ اور مشرق کے دور دراز کے دو باشندوں کا جو درمیانی مقدس رابطہ تھا، اسی سے عرض کر رہے تھے، کچھ دیر یہ وقت بھی خوب گزرا، اور جس وقت مواجہ مبارک میں ہندی، جاوی، بخاری، شامی، مغربی، ایشیائی، افریقی، گورے کالے، لال پیلے، اونچے اونچے قد والے چھوٹی چھوٹی قامت رکھنے والے طرح طرح کے لوگ رجوع ہوتے، سلام عرض کرتے، خدا جانے دوسرے کن نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتے تھے یا اب بھی دیکھتے ہیں لیکن اچانک اپنے خیال کے سامنے حشر کا میدان آ جاتا، وہی میدان جہاں بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح آدم کی اولاد ماری ماری پھرے گی اور العالمین کے رسول پر ایمان لانے والی امت اپنے رسول کو ڈھونڈے گی اور پائے گی، آج ایک ہلکا سا نقشہ اسی میدان کا سامنے تھا، دیر تک اس کے نظارے میں غرق رہتا، بجلی کی طرح دل پر واردات گذرتے، گذرتے رہتے۔

سچی بات تو یہی ہے کہ ہر طرف یہاں بجلی ہی بجلی، برق ہی برق، نور ہی نور تھا، صرف روشنی تھی، تاریکی کا نام نہیں تھا، صرف سکون تھا، بے چینی کا پتہ بھی نہ تھا، صرف محبت تھی محبت ہی محبت کا چشمہ فوارے کی طرح اچھل رہا تھا ابل رہا تھا۔ **صلی اللہ علیہ و علی الہ و اصحابہ اجمعین.**

احسان جس کا صورت احسان میں نہ تھا

ہاں! ایک آخری بات بھی سن لیجئے۔ مدینہ منورہ پہونچ کر اکیس آدمیوں کا یہ قافلہ مختلف قیام گاہوں میں تقسیم ہو گیا، مولانا عبدالباریؒ ان کے والدین اور فقیر کا قیام ایک ہی جگہ تھا، قیام کے ساتھ ہم چاروں کے طعام کا نظم بھی مشترک تھا، روانگی سے پہلے حساب کیا گیا کہ ایک مہینہ تین دن میں طعام کے مصارف کیا ہوئے، کھانے میں فراخدلی اور وسعت سے کام لیا جاتا تھا، ناشتہ میں چائے کے سوا کباب، انڈے، دہی اور طرح طرح کی چیزیں بھی شریک رہتی تھیں، یہ صحیح ہے کہ غیر تاریخی گرانی جس کا تجربہ جنگ عظیم کے بعد والی جنگ اعظم کے بعد دنیا کو ہوا ہے اس کا ذکر تو شاید بنی نوع انسانی کو تاریخ کے کسی دور میں اس کا سا گمان بھی نہ ہوا ہوگا اور موجودہ زمانے کے لحاظ سے نسبتاً ارزانی ہی تھی؛ لیکن جنگ اعظم نہ سہی، یہ سفر ہم لوگوں کا جنگ اعظم کے بعد ہوا تھا، عرب جنگ عظیم سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مسلسل انقلابوں سے اس ملک کو گذرنا پڑا تھا، عربوں کو پیار کرنے والی حکومت ترکی کا اقتدار عرب سے ختم ہو چکا تھا، اس لئے ہندوستان کے لحاظ سے وہاں غیر معمولی گرانی تھی، بھاؤ تو اب یاد نہیں رہا؛ مگر پھر بھی غیر معمولی گرانی ہی تھی۔

مگر مولانا عبدالباری صاحبؒ نے جب حساب کیا تو وہ کچھ ہچکچے سے ہو کر رہ گئے، میں بھی سن کر حیران تھا، جب مولانا فرمانے لگے کہ ایک مہینہ تین دن کی اس پوری مدت میں فی کس آٹھ روپے کا حساب پڑتا ہے، کل آٹھ روپے، جس میں کھانا بھی ہے اور ناشتہ بھی اور چائے بھی، کچھ تکلفات بھی، بار بار میزان کی جانچ کی گئی، مدوں کو دیکھا گیا؛ لیکن آٹھ سے آگے یہ عدد کسی طرح نہ بڑھا، مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ مہمانی میں درحقیقت یہ سارے دن گزرے، آٹھ کا عدد بھی صرف ”پردہ“ تھا۔

اس محسن کریم کے قربان جائیے

احسان جس کا صورت احساں میں نہ تھا

اللّٰھم صلی وسلم و بارک علیه و اله و صحبه و اهل بیته اجمعین. و آخر دعونا ان الحمد لله رب العالمین.

دربار نبوت کی حاضری/۷۹/مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ہے مطالعہ مطلع انوار کا

سال اب خوب خیال میں نہیں ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء ہوگا ایک بار حیدر آباد جانا ہوا، مولانا شیروانی صدر الصدور امور مذہبی کے دولت کدہ پر کوئی علمی کمیٹی تھی، نظر ایک نئے چہرے پر پڑی اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو پڑی ہی رہے ہٹنے نہ پائے، نرم اور روشن چہرہ پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی پر پڑی، تو دل نے کہا اس چہرے کو تو دیکھتے ہی چلے جایئے، بتانے والے نے یہ بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اللہ اللہ کیسا دھوکا ہوا، نام سے عرصہ سے واقف تھا، ایک خیالی صورت بھی ذہن میں تھی؛ لیکن یہ صورت، سیرت ہر چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کرنا غلط نکلا، خیال تھا کہ عمر دراز ہوں گے، یہ تو جوان نکلے، قیاس تھا کہ بڑے بحاث بڑے مناظر ہوں گے اور خشکی و کرختگی کے پتلے، مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو چھپائے ہوئے ہے! خندہ رو، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت برعکس اس کے ایک پیکر لینت ولطافت قال کے موقع پر قال اور حال کے محل پر حال، صورت پر نورانیت برستی ہوئی، گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی، علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق تعارف ہوا اور ملاقات کی پینگ بڑھے، اس اٹھارہ سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا کیا کچھ سیکھا، ان سوالات کو بس سوالات ہی بنا رہنے دیجئے، حیدر آباد کی ہمراہیاں لکھنؤ کی یکجائیاں،

دریابادی کی سرفرازیاں اور پھر عرشہ جہاز پر ساتھ، مدینہ کی روضہ جنت میں ساتھ، بیت اللہ کیطواف وزیارت میں ساتھ، یہ ساری داستاں کہیں پھیلنا شروع ہوگئی تو سمیٹنی مشکل ہو جائے گی مختصر یہ کہ دماغ ایک بہاری سیدزادے کے علم وفضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری سید کی محبوبیت کی نذر ہوگیا تھا، دماغ اگر ایک کی عظمت کا قائل تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل، بہار کی بہار اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟۔

انشائے ماجد/۱۵۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مولانا دریابادیؒ علامہ گیلانیؒ کے مرقد پر

"قبرستان" جی ہاں! نہ کوئی گنبد، نہ کوئی مقبرہ، نہ کوئی حجرہ، نہ کوئی چبوترہ، نہ اونچی پکی قبروں کی قطار، نہ کوئی درودیوار، ایک بڑے طویل وعریض باغ میں خاندان والوں کی دو ایک کچی تربتیں، بس یہ کل کائنات اس گورستان کی! سڑک سے چندمنٹ کے فاصلے پر کھلے ہوئے آسمان کے نیچے مولانا کا مزار پُرانوار..... یعنی مٹی کا ایک ڈھیر، جس کے نیچے جسد خاکی اس مردمومن کا دائمی آرام میں ہے جو وقت کا زبردست فاضل، معقول ومنقول کا جامع، شریعت وطریقت دونوں کا رازداں، ایک بہترین خطیب، ایک بہترین اہل قلم، بے دار دل، روشن دماغ، مورخ، محقق، شاعر، عارف سب ہی کچھ تھا اور ابھی کل تک جیتا جاگتا اور دوسروں کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے تھا!........دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے، ابھی پانچ سال ادھر کی بات ہے، یہی برسات کا موسم تھا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں مولانا اسی باغ میں اپنے اس نیازمند کو سیر کرانے لائے تھے، اس کے دریافت کرنے پر اپنے والدمرحوم کی قبر بتائی تھی، آج اسی کے مزار پر ایک گرفتار قید عنصری کی حاضری تھی، بارش مسلسل جاری تھی، اس پر بھی ہٹنے کا جی نہیں چاہتا تھا، جوکشش، جاذبیت، جومحویت زندگی میں تھی اس کا

ظہور اس وقت بھی ہورہا تھا، زیرلب نیم مضطر حالت میں جو دعائیں، التجائیں، مخاطبے ہوئے وہ اب سب کہاں یاد، اتنا یاد ہے کہ آنسوؤں کے تار کے ساتھ کچھ اس قسم کی صدائیں زیرلب وزبان ٹکراتی رہیں:

دلوں کے دیکھنے والے اور سینوں کے اندر کی خبر رکھنے والے! اپنے دین کے اس دیوانے کو اپنی بہترین نعمتوں اور بخششوں سے سرفراز فرما، اس نے اٹھتے بیٹھتے اپنے کو تیرے دین اور تیرے پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وناموس کے لیے وقف کر رکھا، تو اسے وہ صلہ دے جو اس کے خیال میں نہ آیا ہو، بال بال اسے اپنی رحمتوں اور سرفرازیوں سے نواز دے! اور اس نیک اور پاک روح کے طفیل میں ہم لوگوں کا بھی بیڑا پار کردے جو جو اس سے محبت کا دم بھرتے تھے، بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم، بڑے بڑے عارفوں کا مقولہ ہے کرم میں کون تیرا مقابلہ کرسکتا ہے اور تو اپنے عارفوں کی بات سچ ہی کر دکھاتا ہے، مزار سے اٹھ کر مکان پر آئے چند ہی قدم کا تو فاصلہ تھا، وہ کمرہ دیکھا جہاں مولانا کا پلنگ بچھا رہتا تھا، سید مکارم سلمہٗ نے ہر چیز حتی الامکان اسی طرح رہنے دی ہے جیسے مولانا کی حیات میں تھی، چائے پلوائی، پانی میں شرابور کپڑے آگ پر جلد جلد خشک کرادیے، باتیں زیادہ مولانا ہی کی کرتے رہے، اس سب کے باوجود کچھ زیادہ جی نہ لگا، طبیعت پر وحشت ہی غالب رہی، مکان بغیر مکین کے لطف ہی کیا رکھتا ہے، بلبل خوش نوا اُڑ چکا تھا اور خالی پنجرے میں اب کیا رکھا تھا! جی لگنے کی جگہ تو اب وہی کچی مٹی کا ڈھیر رہ گئی تھی، اس پختہ مکان میں اب کیا تھا؟ بالکل ویسا ہی تاثر حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد تھانہ بھون جا کر پیدا ہوا تھا، خانقاہ وغیرہ کہیں جی نہ لگا، جی پھر کہیں لگا تو اسی شیخ وقت کی کچی تربت پر حاضری دے کر۔

(سیاحت ماجدی، ص ۱۴۰۔۱۴۱)

خواجہ حسن نظامیؒ سے عبدالمجید سالک کی ایک ملاقات

والیِ کپورتھلہ مہاراجہ جگجیت سنگھ نے مسلمانوں کے تالیفِ قلوب کے لئے ایک مسجد تعمیر کی، مسجد بن کر تیار ہوئی تو افتتاحیہ کے لئے عبدالمجید سالک صاحب کو بھی پیغام پہنچا جہاں ان کی ملاقات خواجہ حسن نظامی سے ہوئی۔

خواجہ صاحب نے اپنی جدت پسندی سے کام لے کر اپنے اخبار ''منادی'' میں یہ لکھ دیا تھا کہ مسلمان جھٹکے کا گوشت خدا جانے کیوں نہیں کھاتے؛ حالانکہ یہ بھی ایک قسم کا ذبیحہ ہے، اور سکھ جھٹکا کرتے وقت ''ست سری کال'' پڑھتے ہیں، یعنی خدا کا نام لیتے ہیں، پھر جھٹکے کا گوشت حرام کیوں کر ہوا؟ میں نے خواجہ صاحب کے اس ارشاد پر نہایت دلچسپ ''افکار'' لکھے، جن میں خواجہ صاحب کو ''جھٹکۃ المشائخ'' کا خطاب دیا؛ اگرچہ ان افکار کی اشاعت کے باعث میری طبیعت میں ایک خفیف سا حجاب تھا؛ لیکن میں نے آگے بڑھ کر خواجہ صاحب کے خیمہ کا پردہ اٹھایا اور کھٹ سے داخل ہو گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تپائی کے گرد کرسیاں پڑی ہیں، جن پر بعض حکام ریاست بیٹھے ہیں، سامنے خواجہ صاحب رونق افروز ہیں اور تپائی پر ''انقلاب'' کا وہی پرچا رکھا ہے، جس میں ''جھٹکۃ المشائخ'' پر افکار لکھے گئے تھے، خواجہ صاحب مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے، بہت تپاک سے گلے ملے، مزاج پرسی وغیرہ کے بعد جب بیٹھے تو تھوڑی دیر میں مجھ سے سوال کیا، سالک صاحب! آپ بڑے نکتہ رس آدمی ہیں، بھلا یہ تو بتائیے کہ انسان میں متانت کس عمر میں آجاتی ہے؟ (میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر چوٹ ہے، کہ تم چھتیس سینتیس برس کے ہو گئے؛ لیکن تم میں متانت ابھی نہیں آئی)، میں نے نہایت سوکھا سا منہ بنا کر فوراً جواب دیا، حضرت! بات یہ ہے کہ متانت اور عمر کا تعلق کچھ اعتباری سا ہے، بعض لوگ پیدائشی متین ہوتے ہیں؛ لیکن بعض

صوفیائے کرام تک کو دیکھا ہے کہ پچاس پچاس برس عمر ہونے کو آئی؛ مگر اب تک مسخرے کے مسخرے ہوتے چلے جاتے ہیں، محفل کی خاموشی ٹوٹ گئی اور ایک عام قہقہہ بلند ہوا۔ جس میں خواجہ صاحب نے بھی حصہ کیا اور نکتہ رسی کی داد دی۔

سرگزشت ر ۲۴۷۔ عبدالمجید سالک

حسرت موہانیؒ

(۱)

جب میں نے حسرت کو پہلی بار شاعر کی حیثیت سے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا، وضع قطع بے ڈھب، جسم بے ڈول، لباس بے طور، آواز ناخوش، ان کی ذات میں اتنا کھردراپن نظر آیا کہ پاس جاتے ہی چھل جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا، شاعرانہ بانکپن کا ان کی صورت شکل اور رہن سہن سے کوئی واسطہ نہ تھا؛ بلکہ تعجب ہوتا ہے کہ نازک خیالی اور شوخی نے اپنے ٹھکانے کے لئے کیسا اجاڑ مکان منتخب کیا ہے۔

(۲)

اس منظر میں مجھے یہ دیکھ کر یقین نہ آیا کہ وہ جو کھدر کی اچکن میں دہرے بدن والا بال بڑھائے، پچکی ٹوپی پہنے، ٹوٹی کمانی کی عینک لگائے، بیٹھی ہوئی آواز سے باتیں کر رہا ہے وہی رئیس المتغزلین حسرت موہانی ہے، پہلی نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ اس شخص پر حسرت برستی ہے اس شاعر کا قافیہ عسرت سے ملتا ہے، اس تجربہ کے بعد میں نے پہلی نظر سے کبھی دھوکہ نہیں کھایا؛ کیوں کہ اس کا اعتبار بالکل اٹھ چکا ہے، اب تو کئی کئی بار دیکھنے کے بعد بھی سوچنا پڑتا ہے کہ جو دیکھا وہ کہیں نظر بندی کا عالم تو نہ تھا۔

(۳)

حسرت کا علاج انہوں نے دنیاوی ضروریات کو امکانی حد تک کم کر دینے سے کیا تھا، یہاں تک کہ ایک بار کسی دوست کو لکھا کہ اسمبلی سے ملنے والا سفر خرچ بچا رہا ہوں تاکہ مجلس اقوام متحدہ میں جا کر اردو کا مسئلہ اٹھا سکوں۔ حسرت کی سادگی ان کی آخری منزل نہ تھی، ان کا سفر قناعت سے شروع ہوا اور لاتعلقی پر پہنچ کر ختم ہوا، ان کے انتقال پر مولانا ابو الکلام آزادؒ نے لکھا کہ انہیں دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمان یاد آتے تھے۔

اسلاف کی اس یادگار کو لوگوں نے کھدر کے کپڑے کی دکان کرتے بھی دیکھا ہے، اس دکان پر ایک پیمانہ تھا اور ایک معیار، وہ کپڑے کے لئے اور یہ آدمیت کے لئے۔

آواز دوست ۔ ۷ ۔ ۱۰ ۔ مختار مسعود

مولانا ظفر علی خانؒ

مولانا ظفر علی خان حقہ کے بڑے رسیا ہیں، جب شعر کہتے ہیں تو ضرور پیتے ہیں، اور حقہ پیتے ہیں تو شعر ضرور کہتے ہیں، ان کے شعر کہنے کا انداز یہ ہے کہ حقہ بھروالیا اور شعر کہنے بیٹھ گئے، طبیعت کی روانی کا یہ حال کہ کبھی کبھی فی کش ایک شعر کے حساب سے کہتے چلے جاتے ہیں کبھی خود لکھتے ہیں کبھی کسی کو لکھوا دیتے ہیں، اس وقت ان کا انگوٹھا انگشت شہادت پر نیم دائرہ سا بناتا ہوا گھومتا جاتا ہے۔

لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ فیضی چتوڑ کے محاصرہ کے زمانے میں پہلی مرتبہ اکبر کے سامنے پیش ہوا تو پچاس ساٹھ شعر کا قصیدہ ارتجالا کہہ ڈالا؛ لیکن ہم نے ایسے معرکے بارہا دیکھے ہیں کہ باتوں باتوں میں پندرہ بیس شعر ہوگئے، ادھر حقہ کی نے منہ میں آئی، ادھر انگوٹھا انگشت شہادت پر پہنچا، پیشانی پر بل پڑے دھواں ہوا میں منتشر ہوا اور کھٹ سے شعر

سامنے آ گیا، اب بندش پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں۔

ایک مرتبہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولانا ظفر علیؒ زبان اور محاورہ کے استاد ہیں، اشعار کی بندش خوب ہوتی ہے، لیکن ان کے ہاں حقیقی شاعری بہت کم ہے، میں نے کہا: ذرا بحیرہ قلزم، لندن کی ایک صبح، رامائن کا ایک سین پڑھ کر دیکھئے، کہنے لگے: میں نے یہ نظمیں تو نہیں پڑھیں، لیکن مولانا کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قلب عشق و محبت کے لطیف جذبات سے خالی ہے۔

میں نے گفتگو کا پہلو بدل کر شعر خوانی شروع کر دی، پہلے فارسی کے ایک دو شعر سنائے جب وہ جھومنے لگے تو شاد کا شعر پڑھا۔

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور چل گئے

انہوں نے دو تین مرتبہ یہ شعر پڑھوایا، میں نے پھر کہا۔

سلیقہ مے کشی ہو تو کر لیتی محفل میں
نگاہ مست ساقی مفلسی کا اعتبار اب بھی

وہ شعر سن کر تڑپ گئے کہنے لگے کس کا شعر ہے؟ میں نے پوچھا جو شخص ایسا شعر کہہ سکتا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کہنے لگے اس کے شاعر ہونے پر کیا شک ہے، میں نے کہا: تو پھر سن لیجئے کہ یہ شعر مولانا ظفر علی خاںؒ کا ہے، یہ سن کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا، کہنے لگے

درخرابات مغاں نور خدا می بینم

دراصل مولانا کی شاعری پر تنقید کرنا میرا موضوع نہیں اور یونہی برسبیل تذکرہ یہ باتیں آ گئیں، مجھے تو یہ کہنا ہے کہ مولانا نے اپنی تمام نظمیں بہت تھوڑے وقت میں کہی ہیں، شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جو انہوں نے گھنٹے دو گھنٹے میں کہی ہو، ورنہ ایک نظم پر عموماً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔

مردم دیدہ/ چراغ حسن حسرت/۶۹

مولانا ظفر علی خانؒ کی ایک تجویز

ایک دن زمیندار کے دفتر میں کسی نے کہا کہ چین جاپان، انگلستان، جرمنی اور فرانس کے لوگ مسلمان ہونے پر آمادہ ہیں؛ لیکن انہیں تبلیغ کون کرے؟ مولانا نے فرمایا "بات تو آپ نے ٹھیک کہی، اچھا سالک صاحب! اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیجئے کہ اگر ہم ایک تبلیغی ادارہ کھول لیں تو کیسا ہے؟ ذرا مہر صاحب کو بھی بلوایئے۔۔۔۔ آ گئے مہر صاحب، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر یہاں لاہور میں ایک مرکزی تبلیغی ادارہ کھول لیا جائے اور اس کی شاخیں ساری دنیا میں پھیلا دی جائیں تو کیا ہرج ہے؟ کوئی دس لاکھ روپے خرچ ہوگا، ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟ سات کروڑ نہیں آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہوگی؛ اگر ہر مسلمان سے ایک ایک پیسہ وصول کیا جائے تو کتنے روپے ہوئے ریاضی کا سوال تھا کسی سے حل نہ ہوا، سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، اتنے میں مولانا نے کہا: "آٹھ کروڑ پیسے ہوتے ہیں نا؟ آٹھ کروڑ کو 64 پر تقسیم کیجئے، ساڑھے بارہ لاکھ روپے ہوئے، چلیے دس لاکھ ہی سہی دس لاکھ بہت ہے۔۔ یہ مرحلہ تو طے ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ تبلیغ کا کام کن کن لوگوں کے سپرد کیا جائے؟ لیکن مبلغ بھی چوٹی کے آدمی ہوں، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد فرانس جرمنی وغیرہ میں تبلیغ کریں اور ڈاکٹر اقبالؒ کو چین بھیج دیا جائے، سالک

صاحب آپ اور مہر صاحب مل کے اخبار سنبھالیے، میں تو اب تبلیغ اسلام کا کام کروں گا،
کچھ دیر تو دفتر میں سناٹا رہا، آخر ایک صاحب نے جی کڑا کر کے کہا کہ مولانا! اس میں کوئی
شک نہیں کہ تجویز بہت خوب ہے؛ لیکن روپے جمع کیسے ہوگا؟ آخر مسلمانوں سے دس لاکھ
روپیہ جمع کرنے کے لئے بھی ایک لاکھ روپیہ چاہیے، آپ کہیں سے ایک لاکھ روپے کا
انتظام کردیجئے، باقی کام ہم سنبھال لیں گے، مولانا نے فرمایا ''ہاں بھئی یہی تو مشکل ہے''
یہ کہہ کے منہ پھیر کر حقہ کی نے سنبھالی، انگوٹھا انگشت شہادت پر نیم دائرہ بناتا گھومنے لگا اور
اس تبلیغی ادارہ کے اجزاء حقہ کے دھوئیں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئے، میرے سامنے
بھی ایسے ایسے معرکے گزر گئے ایک مرتبہ دارالترجمہ کھولنے کی تجویز ہوگئی اور مولانا نے تہیہ
کرلیا کہ اخبار کو چھوڑ کر کرم آباد جا بیٹھیں اور مترجموں کی اچھی خاصی فوج جمع کر کے
انگریزی ادب پر دھاوا بول دیں؛ لیکن دو تین لاکھ روپے سے کم میں ہی مہم شروع نہیں
ہوسکتی تھی اس لئے یہ خواب بھی پریشان ہو کر رہ گیا۔

مردم دیدہ، چراغ حسن حسرت ۴۳؍

مولانا ظفر علی خانؒ اور پابندی نماز

(۱)

مولانا ظفر علیؒ خان کو گھر میں آباؤ اجداد کی دینی پابندیوں نے اوائل عمر سے ہی
نماز کا سخت پابند بنادیا تھا ایک دفعہ میچ میں ریفری کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ نماز کا
وقت ہوا، سیٹی بجائی اور میچ کو یہ کہہ روک دیا کہ کھیل نماز کے لئے بند کیا جاتا ہے، خود امامت
فرمائی، نماز پڑھائی ایسے ہی دو واقعے جب انہوں نے نماز کے لئے کسی مصلحت کا خیال نہ
کیا اور وقت نماز پر ادا کی۔

(۲)

۱۹۱۱ء میں جب وہ دہلی دربار دیکھنے گئے تو شاہی جلوس کو دیکھنے میں گھنٹوں لگ گئے اسی درمیان نماز کا وقت آپہنچا انہوں نے وہیں اذان دی اور نماز پڑھی۔

(۳)

۲۰ / مارچ / ۱۹۳۱ء کو کراچی میں کانگریس کے اجلاس میں نماز کا وقت آگیا جس کے لئے انہوں نے وقفہ طلب کیا جو نہ مل سکا تو احتجاجا باہر نکل آئے اور یہ اشعار ارتجالا زبان پر آگئے:

پڑھتے نہیں ہیں قوم کے لیڈر نماز کیوں
کھویا گیا ہے قوم سے یہ امتیاز کیوں

انہوں نے ان مسجدوں کے خلاف بھی عملی اقدام کیا جن پر یہ لکھا تھا کہ وہابیوں کو داخل ہونا منع ہے، بے دھڑک دوسرے فرقوں کی مساجد میں داخل ہوجاتے اور نماز پڑھ لیتے بلکہ ان کی تبلیغ بھی کرتے، جس کی وجہ سے پریشانیوں کا شکار بھی ہوئے اور جیل بھی گئے۔

چنانچہ انہوں نے عبداللہ چکڑالوی (چونکہ اہل قرآن تھے) کی مسجد میں نماز پڑھی، جسکی وجہ سے ۱۰۷/۱۰۱ کے تحت چالان ہو گیا اور گرفتار کر لئے گئے، بعد میں اہل قرآن نے اس مقدمہ کو واپس لے لیا، لطف ومزے کی بات یہ ہے کہ وہ مرزائیوں کی مسجد میں تبلیغ کے لئے پہنچ گئے جس کے دو روز کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا، چندہ ماہ کے بعد پولس نے مقدمہ واپس لے لیا۔

انہوں نے نماز کی پابندی کے لئے ایک "نماز کمیٹی" کمیٹی بنائی، جو فجر کے وقت گھر گھر جاکر لوگوں کو نماز کے لئے بیدار کرتی اور خود بھی اس میں شریک رہتے۔

وہ مسجد کو کعبہ کی بیٹی کہتے، کہ احترام مسجد قائم مقام احترام کعبہ کے ہے، وہ آزادی مسجد کو آزادی وطن کے دوسرے نام سے تعبیر کرتے۔

ان کے لئے لاہور کی شاہی مسجد میں جمعہ پڑھنا زیادہ اہمیت رکھتا تھا وہ کہتے کہ عالمگیر نے یہ وسیع مسجد بے کار نہیں بنائی بلکہ اس کا مقصد تھا کہ جمعہ کو عظیم اجتماع ہو۔

مولانا ظفر علی خان احوال و آثار ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی ر ۲۴۲

مولانا ظفر علی خانؒ کی حاضر جوابی

مولانا ظفر علی خانؒ مضبوط ارادے کے مالک اور عمل کے انسان تھے، جس کام کو ٹھان لیتے اسے کر گزرتے، جس بات پر جم جاتے اس سے نہ ہٹتے، نہ مخالفین کی باتوں کی پرواہ کرتے، نہ ارادے میں کوئی اضمحلال طاری ہوتا، بولنے میں نہ کم نہ زم، پیہم اپنے عملی و علمی زندگی کا عمل جاری رکھا۔

بقول چراغ حسن حسرت: وہ گفتگو کرتے وقت ادبیات و مذہب سے سیاست پر آ جاتے، میں چاہتا وہ شعر و شاعری کی طرف آئیں تو وہ ہم سب کو سیاست کی طرف کھینچ لے جاتے، اسی طرح وہ ہمیں گلیوں اور شاہراہوں کی سیر کراتے رہتے۔

مولانا کو خدا نے زبان بھی بولنے والی خوب عطا کی تھی، طلاقت لسانی کے وصف سے خوب متصف تھے بولنے میں نہ کوئی باک محسوس کرتے نہ خوف، سچی اور حق بات بولتے اس معاملہ میں مصلحت آمیزی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہتا، گفتگو کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا ان کی فطرت میں نہیں تھا۔

اردو سے محبت کا عالم ہی دوسرا تھا گھر میں بیوی کے علاوہ کسی کو جرات نہ تھی کہ وہ پنجابی میں گفتگو کرے، اس معاملہ میں بہت متشدد اور سخت واقع ہوئے تھے، اردو سے محبت

ان کے مزاج میں بالکل رچ بس گئی تھی، اس کی نوک پلک سنوارنے میں پوری زندگی وقف کر دی۔

مولانا بلا کے حاضر جواب بھی تھے۔ جس کے کبھی مخاطب خاموش ہو کر منہ تکتا اور کبھی سامعین خوب محظوظ ہوتے، زمیندار اخبار کے مفروضہ ایڈیٹر لعل شاہ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے ایک مضمون کے سلسلہ میں مقدمہ قائم ہوا، عدالت میں پیش ہوئے، عذر یہ بیان کیا گیا یہ کہنا لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، اس مضمون کی انہیں کچھ خبر ہی نہیں اس لئے یہ مقدمہ فرضی ہے، عدالت نے سوال کیا:

''آخر لعل شاہ اخبار کا کام کس طرح چلاتے ہیں''؟

مولانا نے فوراً جواب دیا:

''جس طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ حکومت کا کام چلاتے تھے''

مولانا کا مذاق سخن غیر معمولی طور پر بلند اور لطیف تھا۔

اخبار کا ہر جملہ جو درج کیا جاتا، ہر فقرہ جو لکھا جاتا اس کا ان کی نظروں سے گزرنا لازمی تھا؛ اگر ان کے مذاق سخن پر پورا اترتا تو انعامات کی بارش بھی کرتے ورنہ فرماتے'' یہ بات ہمارے مذاق سلیم پر گراں گزری''۔

مولانا ظفر علی خان احوال آثار/۲۶۶ تا ۲۷۰۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

سروجنی نائیڈو

کعبہ دل میں ایک روز جھانکا تو دیکھا کہ ایک صنم نے وہاں گھر کر لیا ہے، ہمیں گمان تھا کہ دور آزری ختم ہوئے مدت بیت چکی ہے اور اس عرصہ میں دل اگر صحن مسجد نہیں بن سکا تو کیا غم کم از کم بت کدہ تو نہیں رہا، اب جو یہ گمان غلط نکلا تو اپنے ہی بارے میں لا

علمی پر تشویش ہوئی یہ کس کا بت ہے، جواب تک سلامت ہے اور نہاں خانۂ دل میں کیسے آن چھپا ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو یہ بت ایک دیوی کا نکلا، دبلی پتلی، بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن، بالوں میں گھنگھر ہیں اور چھوٹا سا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا ہے، جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار، بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے، ساڑی کا پلو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے، صورت من موہنی، پہلی نظر میں پر اثر، دوسری میں پر اسرار، میں نے بھی جب اس بت کو دوسری بار نظر بھر کر دیکھا تو صورت کی بدلی ہوئی تھی، بھاری بھاری سانولی اور معمر عورت نے سلک کی سلیٹی ساڑی باندھی ہے، پلو سر پر ہے، اور نصف چہرہ بھی اس میں چھپا ہوا ہے، اس نے دائیں ہاتھ سے ایک خوش نما قوس بنائی اور اسے آبرو کے سامنے لاکر سر کی ہلکی سی جنبش کی ساتھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اراکین کو جو وکٹوریہ گیٹ میں صف بستہ کھڑے تھے یوں آداب کیا گویا وہ مسلم تمدن کا مرقع ہے یا شائستگی کا مجسمہ، آداب کرتے ہوئے ساڑی کا پلو چہرہ سے ڈھلک گیا تو ہم نے پہچانا کہ یہ سروجنی نائیڈو ہیں۔

آواز دوست رمختار مسعود ر ۱۵۳

ترکی کا ایک مرد غیور رووف بے

(۱)

کئی برس پہلے جامعہ اسلامیہ مظفر پور کے جلسہ میں شریک ہوا، جن میں دو بڑے مفکرین کی آمد کا اعلان تھا ایک حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب دوسرے مولانا

خلیل الرحمن سجاد نعمانی صاحب، اس سے پہلے کبھی ان حضرات کی تقریر سننے کا اتفاق نہ ہوا تھا اور نہ تو اس وقت میرے پاس موبائل تھا کہ ایک کلک سے ان تک پہنچ جاتا پہلی تقریر مولانا سلمان ندوی صاحب کی تھی، تقریر کیا تھی پورا جلسہ ہمہ تن گوش اور مولانا کی گھن گرج آسمان ہلائے جا رہی تھی، تقریر ختم ہوئی آخری تقریر مولانا سجاد نعمانی صاحب کی ہوئی، تقریر کا خاص موضوع تھا "علم محنت طلب کرتا ہے" پھر وہ "کہہ" کو "مہ" ذرہ کو آفتاب، فرش کو عرش بنا دیتا ہے اور مولانا علی میاں ندویؒ کے کئی واقعات سنائے، انہوں بتایا کہ کبھی ایسا ہوتا کہ ان کے پاس خط لکھنے کے لئے لفافہ اور کبھی رکشہ کا کرایہ نہ ہوتا؛ لیکن علم نے ان کو اس معراج تک پہنچایا جہاں ہمہ شما کی رسائی ناممکن ہے فرمایا: انہیں شاہ فیصل ایوارڈ ملا اسی مجلس میں پوری رقم سانحہ افغانستان کے متاثرین کے حوالے کر دی۔

(۲)

آج عبدالمجید سالک کی 502 صفحات پر مشتمل کتاب جو تقریباً ایک مہینہ سے زیر مطالعہ ہے۔ ابھی تک 270 صفحہ ہی پڑھ سکا تھا، پڑھنا شروع کیا ایک واقعہ نے برسوں پہلے ایک جلسہ میں پہنچا دیا جو اوپر درج ہو چکا ہے، وہ واقعہ آپ پڑھ لیجیے۔

جامعہ ملیہ میں تقریر کرنے کے لئے نامور لیڈر، حمیدیہ کے کمانڈر، سابق وزیر اعظم ترکی رؤوف بے کو دعوت دی گئی ہے، اس وقت رؤوف بے مصطفیٰ کمال پاشا سے ان بن کی وجہ سے جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہے؛ لیکن ان کی عظیم الشان اور قابل قدر خدمات کی وجہ سے ترک قوم انہیں آنکھوں کا سرمہ بنائے ہوئے تھی اور دنیائے اسلام میں بھی ان کی خدمات قابل دید اور لائق ستائش تھی، بارہا ایسا ہوا کہ جلا وطنی کی زمانہ میں روٹیوں تک کے محتاج ہو گئے، بہت سے مسلمان اور ذی اثر امراء نے ان کی مدد کرنی چاہی؛ لیکن اس غیور

ترک سپاہی کی رگ حمیت نے کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کیا، ایک مرتبہ پیرس میں شوفر کی نوکری بھی کی، جامعہ ملیہ میں تین ہزار روپے کی رقم ان کو معاوضہ کے طور پر پیش کی گئی اس بہادر ترک نے وہ رقم لے کر پھر جامعہ ملیہ کو عطیہ کر دی؛ حالانکہ یہ ان کے جلاوطنی کے دن تھے۔

اسی سفر میں وہ لاہور بھی تشریف لے گئے باتوں باتوں میں انہوں نے مصطفیٰ کمال کی آزادہ روی اور لادینیت کی شکایت کی اور ان کی پالیسیوں کو ترکی عوام کے لیے مضر بتایا، تو میں پوچھ بیٹھا کہ آپ کی ترک عوام میں ایک حیثیت ہے آپ کا اثر و نفوذ بھی زیادہ ہے، آپ ان کو گرانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، انہوں نے جو جواب دیا اسے سن کر ہم حیران اور ششدر رہ گئے اور جان لیا کہ بیدار رہنماؤں کے نزدیک قوم کی فلاح ضروری ہوتی اور ذاتی اختلافات کو وہ اپنے ہی حد تک محدود رکھتے ہیں، انہوں فرمایا کہ

"میرے بھائی! زندگی بے حد مختصر ہے، کوئی شخص ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا، کمال پاشا کو طبعی موت مر جانے دو، اس کو گرانے کی کوشش ترک قوم کے لئے خطرناک ہے، آج ڈیڑھ کروڑ ترک مسلمانوں کی جو عزت و توقیر دنیا میں ہے، وہ اسی بدعقیدہ ملحد کے دم سے ہے"۔

غازی رؤف بے نے حبیبیہ حال (اسلامیہ کالج لاہور) میں ایک شاندار تقریر کی، اس میں کمال پاشا کے متعلق بتایا کہ اگرچہ ان کے بعض عقائد سے مجھے اختلاف ہے؛ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آج عسکری مہارت میں دنیا بھر کا کوئی بھی جرنیل ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کچھ مدت کے بعد ہم نے سنا کہ مصطفیٰ کمال پاشا جن کی مردم شناسی میں کوئی شبہ نہ تھا، نہایت عزت و احترام کے ساتھ ترکی بلوالیا ہے اور اہم قومی خدمات ان کے سپرد کر دی ہیں۔

سرگزشت/۲۹۱_عبدالمجید سالک

فیصل ایوارڈ کی تقسیم ۲۰/۱۲/۱۹۸۰ء

مولانا سید محمد اجتباء ندوی کے خط سے اقتباس / پندرہ روزہ تعمیر حیات

ڈاکٹر خبیب احمد نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا تذکرہ کیا اور کہا کہ مولانا کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کی خدمات اور گرانمایہ خدمت سے کون نا واقف ہے، اس کا اظہار افسوس کرتے ہوئے کہ مولانا مدظلہ بعض مجبوریوں اور صحت کے خرابی کے بنا پر خود تشریف نہیں لائے ہیں؛ بلکہ اپنی نمائندگی کے لئے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ ریڈر شعبہ عربی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی مکہ مکرمہ کو بھیجا ہے، انہیں ایوارڈ قبول کرنے کے لئے دعوت دیتا ہوں۔

ڈاکٹر ندوی صاحبؒ ایک باڈی گارڈ کے ہمراہ اسٹیج کے پاس تشریف لے آئے، امیر ولیعہد نے کھڑے ہوکر مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور مبارکباد کے ساتھ ایوارڈ پیش کیا، ڈاکٹر ندویؒ آگے بڑھ کر مائک پر تشریف کے آئے اور حضرت مولاناؒ مدظلہ کا پیغام پڑھ کر سنایا، جو مجمع کے لئے باعث توجہ بن گیا، بار بار لوگ گردن اٹھا کر پڑھنے والے کی جانب دیکھ رہے تھے، محترم ولیعہد اور امراء ہمہ تن گوش تھے اور جب ڈاکٹر ندویؒ نے اعلان کیا کہ حضرت مولاناؒ مدظلہ نے اس ایوارڈ کی ساری رقم کو مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کردینے کے لئے مجھے ہدایت دی ہے، تو پورا ہال تالیوں اور اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور تمام لوگ سراپا اشتیاق بن کر متوجہ ہوگئے، ایوارڈ کی نصف رقم مجاہدین افغانستان، ایک چوتھائی مدارس حفظ قرآن جس کی نگرانی شیخ محمد صالح قزاز کرتے ہیں اور دوسری چوتھائی رقم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کو دینے کا اعلان کیا، گویا تمام رقم ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے ''سبل خیر''

میں صرف کر دی، اہل تعلق جانتے تھے کہ حضرت مولانا مدظلہ ایسا کوئی خیر کا کام کریں گے؛ لیکن ہال میں بیٹھے ہوئے بیشتر حضرات اور خصوصا بڑی شخصیتیں محو حیرت تھیں، کہ رقم آمدنی سے پہلے صرف کر دی گئی۔

پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام

نظر ثانی کے لئے ڈسک پر رکھی اپنی زیر ترتیب کتاب (اور میں پڑھتا گیا) جو اب منتظر اشاعت ہے، جب بھی نظر پڑتی، اٹھاتا اور اس واقعہ کو ضرور پڑھتا، جس سے ایک کیف، سرور ایک نئی روشنی سی محسوس ہوتی، پڑھئے لطف لیجئے اور اپنا محاسبہ بھی کیجئے۔

اردو بازار میں مولوی سمیع اللہ صاحب کی دکان پر جناب شمس زبیری نے مجھے شیخ فضل الٰہی سے متعارف کرایا اور انہوں نے ایک ذکر پر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک لنگڑے شخص کو دور سے دکھلایا اور بتلایا کہ یہ داڑھی والا معذور شخص جیب تراشوں کا خلیفہ ہے، صبح کو جب یہ اپنے دس دس بارہ بارہ سال کے بچوں کو کیسہ تراشی کی تعلیم دیتا ہے اور قمچی لیکر بھیڑ بھڑ کا میں تیرنا سکھاتا ہے، وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، ہر بچہ اپنا گھنگھروں والا فرغل پہن کر ٹیڑھی میڑھی لکیروں پر اس طرح چلتا ہے کہ ایک گھنگھروں بھی آواز نہیں دیتا؛ حالانکہ اس کے دامن اور آستین گھنگھروں کی قطار سے بھری ہوتی ہیں، چلتے میں جہاں کسی کا گھنگھروں بجا وہیں خلیفہ کی قمچی نے احتساب کیا؛ مگر اس خلیفہ کے شاگردوں میں نہ تو کوئی شراب پیتا ہے نہ تو کوئی جوا کھیلتا ہے، نہ تو کسی کو چرس کا لپکا ہے، نہ تمباکو کا نشہ؛ اگر خلیفہ ان سے ذرا کسی لڑکے نے شکایت کر دی کہ ان کی عدم موجودگی میں یہ سگریٹ پی رہا تھا اور خلیفہ کی تحقیق و تفتیش میں وہ صحیح ثابت ہوگئی بس پھر کیا ہے، قمچی سے کمر نیلی کر دیتا ہے، یہ عجیب قسم کا استاذ ہے ہر وقت اس کی تلقین ہے کہ نشہ پینے سے ہاتھ میں رعشہ آجاتا ہےاور پھر فنکار

صفائی سے کیسہ نہیں کاٹ سکتا، اسی طرح یہ اپنے شاگردوں کو روزاخلاقی جرائم کے خلاف لیکچر دیتا رہتا ہے،اس کے تمام شاگرد جو کما کر لاتے ہیں، وہ اس خلیفہ کے پاس جمع کرتے ہیں اور یہ پھر مناسب حصہ لگا تقسیم کردیتا ہے، یہی نہیں یہ شاگردوں میں عید تیوہار کے علاوہ ان کی رسم ختنہ اور شادی وغیرہ میں اپنے بچوں کی طرح جی کھول کر صرف کرتا ہے،اس کے شاگردوں میں کوئی ایسا نہیں جو نماز نہ پڑھتا ہو اور دنیا کے لہولعب میں مبتلا ہو، الا جیب تراشی کے، اس کا ایک شاگرد ایک شام سوا دو روپئے لاکر خلیفہ کے سامنے رکھ دیئے خلیفہ اس کی طرف آنکھیں نکال کر کہا: اے خبیث! صدر بازار میں پہاڑ سا دن اور یہ سوا دو روپئے؟ بے ایمان یہ کس غریب کا مار دیا؟ خدا کو کیا جواب دے گا، اب اتنے پیسوں پر بھی کوئی ہاتھ ڈالتا ہے، شاگرد نے بصد عجز عرض کیا، خلیفہ کیا بتلاؤں میں نے تو کئی ہزار پر ہاتھ مار دیا تھا؛ مگر وہ کمبخت انگریز تھا، مجھے تھوڑی دور چل کر یہ خیال آیا کہ، قیامت کے میدان میں اگر عیسیٰ نے میرے آقا ﷺ سے یہ شکایت کی کہ دیکھئے آپ کے امتی نے میرے امتی کی جیب کاٹی تھی، تو حضورؐ کو ملال ہوگا، یہ خیال آتے ہی میں واپس ہوا اور بٹوا اسے واپس کردیا، وہ میرا نام پتا بھی پوچھتا رہا؛ لیکن مجھے اس قدر ندامت تھی کہ میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکا، اس کے بعد ایک سیٹھ جی کی جیب ٹٹولی تو اس کے پاس یہ صرف سوا دو روپئے نکلے، جو آپ کی نظر ہے، خلیفہ نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور خوش ہوکر اپنی انٹی سے اسے دس روپئے بطور انعام مٹھائی کھانے کے لئے دیئے اور کہا کہ خدا تیرے ایمان کو روشن کرے، تو نے نہایت اچھا کام کیا ہے، بیٹا! تو نے عصمت رسول کی حفاظت کی ہے، خدا تیری حفاظت کرے گا، میں تو سن کر چکرا گیا، کہ جیب تراشی میں کردار اور اتنی پاکیزہ تعلیم، یہ تو آج بڑی بڑی خانقاہوں میں نہیں اور خلیفہ کے اس شاگرد کی مثال تو دور دور نظر نہیں آتی، غالباً خلیفہ کو یہ معلوم ہے کہ

صاحب ولایت؛ اگر غاصب کی جیب کاٹ لے تو خدا معاف کرنے والا ہے، اسے بخشش سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

جہان دانش/ص ر ۵۲۷۔احسان دانش
اور میں پڑھتا گیا رمنتظر اشاعت/محمد فہیم قاسمی گورکھپوری

پہاڑ کھودنے والے زمیں سے ہار گئے

مولانا ظفر علی خاںؒ بہت سخی اور فیاض قسم کے انسان تھے اور درویش صفت طبیعت کے مالک بھی، قدرت نے ان کا مزاج شاہانہ اور دل قلندرانہ بنایا تھا، یہاں تک کہ جب وہ جیل میں تھے ان کا کھانا گھر سے آتا، وہ کھانا دوسروں میں تقسیم کر دیتے اور خود چائے اور بسکٹ پر گزارا کر لیتے، صوم وصلوٰۃ کے پابند قول کے سچے عمل کے پکے اور بڑے ہی وضعدار۔

ان کی وضع کی پابندی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، خواہ وہ لباس ہو یا طرز زندگی، دو چیزوں کے سخت اور شدید مخالف تھے اور اخیر تک رہے، ایک انگریز دوسرے قادیانی پیغمبر۔ اور یہی دو چیزیں ان کے مزاج میں مخالفت کا خاصہ بن گئیں۔

''وہ مزاج کے زجاج تھے اور خود خارا تراش''

شورش کاشمیری قید سے چھوٹ آئے تو ان سے کہا:

''جو انگریز سے لڑتا ہے وہ بہادر ہے تم نے اس باب میں جوانمردی کا ثبوت دیا ہے، میرا دل تمہیں دعائیں دیتا ہے''۔

انہوں نے جن اصولوں کو اپنا لیا تھا اس سے پیچھے ہٹنا یا اس سے انحراف کرنا انہیں سرمو گوارانہ تھا، بلاشبہ وہ منافق نہ تھے، ریاکاری کا ان میں نام نہ تھا، دوسروں کا دھوکہ کھاتے

رہے؛ لیکن کبھی کسی کو دھوکہ نہ دیا، ان کے کھرے پن نے دوسروں پر اعتبار کیا اور اسی اعتبار نے انہیں بھی نقصان پہنچایا اور ان کے اخبار کو بھی۔

مولانا کی صحت بہت اچھی تھی، چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے کہ بن دیکھے ان کے بارے میں یہ خیال تھا کیم وشحیم پیٹ نکلے ہوئے ہونگے؛ مگر جب دیکھا تو ایسا کچھ نہ تھا، پیٹ نہ نکلنے کا راز مجھ پر بعد میں کھلا کہ ایک شب فجر سے پہلے ہی مولاناؒ آدھمکے مجھے جگایا اور کہا چلو سیر کو، وہ تو بروقت دوست کی نصیحت کام آگئی (کہ جس نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اگر کبھی مولاناؒ سیر کو لے جائیں تو مت جانا، کئی کلومیٹر دوڑاتے ہیں، ڈنڈ مرواتے ہیں، پھر نماز بھی پڑھاتے ہیں) اور طبیعت کی ناسازی کا بہانا کر کے سوگیا۔

مگر اب عمر ہو چلی تھی، ہاتھوں میں رعشہ طاری ہوگیا تھا، ۲۷/ دسمبر ۱۹۵۶ء بر وقت دوپہر بارہ بج کر بیس منٹ پر اپنے وطن کرم آباد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، ادب وصحافت کا یہ جری انسان جو زمانہ سے کبھی نہ ہارا، موت کے ہاتھوں ہزاروں من مٹی کے نیچے سوگیا۔

مولانا ظفر علی خان احوال وآثار ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی ۲۶۰ تا ۲۸۲

بیگم حسرت موہانی

حسرتؒ نے آزادی کے بعد ایک محفل میں ایسی تین خواتین کا ذکر کیا جن کے شوہر جنگ آزادی کے مجاہد تھے اور انہوں نے اپنے شوہروں کی قید وبند کی زندگی کے دوران ہر ممکن ذہنی وجسمانی تکالیف برداشت کیں اور کبھی شکایت نہیں کی، یہ تین خواتین بیگم حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد کی بیوی زلیخا اور پنڈت جواہر لال نہرو کی بیوی کملا نہرو، فرماتے ہیں:

''یہ تین عورتیں نہ ہوتیں تو وہ خود کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے، مولانا آزادؒ الہلال یا البلاغ نکال رہے ہوتے اور پنڈت جواہر لال نہرو زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے، انہوں نے جان دے دی؛ مگر ہم سے یہ مطالبہ نہ کیا کہ لیلائے سیاست کے پرستاروں تم جیل جا رہے ہو تو ہمارا کیا ہوگا''۔

ابوالکلام آزادؒ اور جواہر لال نہرو کی بیویوں پر حسرتؒ کی بیوی کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل تھی کہ ان کے ایثار اور قربانی کی داستان ۱۹۰۸ء سے شروع ہوئی تھی، جب حسرت پہلی بار قید و بند کی صعوبت سے دوچار ہوئے، اس وقت ابوالکلام آزادؒ سیاسی لیڈر کی حیثیت سے روشناس نہیں ہوئے تھے اور جواہر لعل نہرو انگلستان میں زیر تعلیم تھے، جواہر لعل نہرو کی شادی بھی نہ ہوئی تھی، حسرت موہانی کی اس بیوی سے ایک لڑکی نعیمہ ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئی اور اس کے بعد ان کی اس بیوی سے اور کوئی اولاد نہ تھی۔

حسرت موہانی اور انقلاب آزادی / ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی / ۵۷

بزمِ عیش و عشرت

اندلس کی مرکزی حکومت ختم ہو چکی تھی، طوائف الملو کی پھیلی ہوئی تھی، تقریباً ہر ضلع کا حاکم وہاں بادشاہ بن بیٹھا تھا، ان ہی ملوک الطوائف میں ایک مشہور اندلسی امیر معتمد بھی ہے، جس کا پایہ تخت قرطبہ تھا، بہر حال اس معتمد کی ایک معشوق بیوی تھی جس کا نام اعتماد تھا، لکھا ہے کہ

اعتماد کی ذرا سی ناگواری معتمد کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی تھی، ایک دن جھروکے سے باہر کے میدانوں کا نظارہ اعتماد کر رہی تھی، معتمد بھی بیٹھا تھا، اس وقت اتفاقاً

برف گر رہی تھی، اندلس میں یہ صورت کم پیش آتی ہے، برف باری کا یہ نظارہ اعتماد کو اتنا پسند آیا کہ اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، معتمد نے آنسوؤں کو دیکھ کر، گھبرا کر پوچھا کہ تم رو کیوں رہی ہو؟ اس نے کہا کہ کیوں نہ روؤں، تمہیں دنیا کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں ہوتی؛ ورنہ موسم سرما میں ہر سال جی چاہتا ہے کسی ایسی جگہ جا کر ٹھہروں جہاں برف باری کا یہ نظارہ میرے سامنے پیش ہوتا رہے، سفید سفید برف کی پھواریں کتنی خوبصورت ہیں، معتمد نے یہ سن کر اسی وقت باغوں کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا کہ محل کے چاروں طرف جو میدان ہے اس میں بادام کے درخت اس ترکیب سے نصب کئے جائیں کہ آئندہ موسم سرما میں ان کے سفید سفید پھول اسی طرح کا نظارہ پیش کریں، جو اس وقت نظر آرہا ہے، حکم کی تعمیل کی گئی، اعتماد خوش ہوگئی۔

اس سے بھی دلچسپ قصہ اسی اعتماد کا یہ ہے کہ معتمد نے ایک دن پھر اس کو کچھ غمزدہ سا پایا، وجہ پوچھی تو بولی، تمہارے محلوں میں آکر میری زندگی اکارت ہوگئی، آج میں آرہی تھی راستہ میں چند مزدورنیوں کو دیکھا کہ کیچڑ میں وہ کام کر رہی تھیں اور گاتی جاتی تھیں، ہائے کیا زندگی ہے، میرے لئے بس یہی قید و بند کی زندگی مقدر تھی، سننے کے ساتھ معتمد نے حکم دیا کہ مشک و عنبر اور دوسری خوشبودار چیزوں کی ڈھیر لگادی جائے اور بجائے پانی کے عرق گلاب سے اسے تر کیا جائے، یہی کیا گیا، اس نے اعتماد سے کہا کہ جاؤ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسی کیچڑ کو روندو، وہ اتری اور سہیلیوں کے ساتھ اسی مشکیں و عنبر کو روندتے ہوئے گاتی جاتی تھیں، لکھا ہے کہ بعد کو اعتماد کبھی معتمد سے ناقدری کی شکایت کرتی تو کہتا، کیا کیچڑ والے دن بھی میں نے تمہاری ناقدری کی؟

(ملوک الطوائف/ص/۲۰۶۔ مقالات احسانی/۹۳)

لیکن زندگی کا انجام نہایت ہی عبرت ناک ہوا، جیل کی کال کوٹھری میں قید دنیا سے رخصت ہوا، جیل کے اندر اس کے دردناک اشعار انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

وفادار ساتھی

ایک مرتبہ ایک شخص نے منصور کے دربار میں بیان کیا کہ خلیفہ ہشام اموی نے فلاں جنگ میں نہایت تدبر سے کام لیا تھا، منصور کو اس جنگ کے حالات معلوم کرنے کا شوق ہوا، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ رصافہ میں ایک ضعیف العمر آدمی رہتا ہے، جو ہشام کا رفیق کار رہ چکا ہے، منصور نے اسکو بلا کر پوچھا:

تم ہشام کے ساتھ رہ چکے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا، منصور نے پوچھا فلاں سن میں جو معرکہ ہوا تھا اس میں ہشام نے کس تدبیر اور حکمت عملی سے کام کیا تھا، اس شخص نے جنگ کے واقعات کی تشریح ایسے انداز میں شروع کی جو منصور کو پسند نہ آئی، وہ کہنے لگا، خلیفہ ہشام اموی خدا اس پر ہزار ہزار رحمتیں نازل کرے، اس نے یوں کیا، خدا اس کی قبر کو نور سے منور کرے، اس نے یہ تدبیر کی۔

منصور آخر ضبط نہ کرسکا اور ڈانٹ کر کہا، اے خدا کے دشمن! یہاں سے چلا جا، میرے سامنے میرے دشمن کے حق میں رحمت و رضوان الٰہی کی دعائیں کرتا ہے۔

بوڑھا واپس ہونے لگا: مگر جاتے جاتے یہ کہہ گیا امیر المومنین! میں آپ کے دشمن کا اس درجہ احسان مند ہوں کہ موت کے بعد بھی اس سے سبکسار نہیں ہوسکتا۔

منصور نے یہ سن کر اسے واپس بلانے کا حکم دیا، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو کہنے لگا، امیر المومنین آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جس شخص کا میں مرہون منت ہوں اسے نیکی سے یاد کرنا کیا میرا فرض نہیں ہے۔

خلیفہ متنبہ ہوا، بے شک فرض ہے اور تمہارے خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک شریف الطبع، احسان شناس اور کریم النفس انسان ہو۔

اس کے بعد منصور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا اور جب وہ جانے لگا تو انعام کا حکم دیا، اس کے جانے کے بعد خلیفہ اس کی تعریف کر کے کہنے لگا:

''کاش مجھے بھی ایسے مخلص اور وفادار ساتھی مل سکتے''۔

ماہنامہ مشرب/رجاہد ملت نمبر/۵۲

بیگم اقبال

جاوید اقبال اپنی سوانح عمری ''اپنا گریباں چاک'' میں اپنے بچپن کے واقعات درج کئے ہیں۔

جاوید اقبال گیارہ اور منیرہ ابھی پانچ سال کی تھیں کہ ان کی والدہ سردار بیگم کا انتقال ہو گیا؛ منیرہ کو تو ماں نقش کچھ یاد نہ رہا البتہ جاوید اپنی والدہ کا عکس و نقش بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والدہ خوبصورت اور مدبر خاتون تھیں، رنگ کھلتا ہوا سانولا، آنکھیں موٹی موٹی، ناک ستواں، ہونٹ پتلے، پیشانی فراخ اور چہرہ بیضوی، جسم متناسب اور قد درمیانہ، بڑی نرم دل اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔

والدہ جہاں نماز و روزہ کی پابند تھیں وہیں، بہت ہی توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد بھی واقع ہوئی تھیں اور اس میں پورا ساتھ ان کے ساتھ آئی ہوئی ایک خاتون دیتی تھیں۔

جاوید لکھتے ہیں کہ میں سات آٹھ سال کا ہو گیا تھا؛ مگر اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاتا تھا اور والد صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر کھاتے تھے، اس معاملہ میں والدہ کو کبھی کبھار ڈانٹتے بھی تھے کہ یہ بڑا ہو جائے گا تب بھی کھانا اپنے ہاتھ سے نہ کھا سکے گا اور اسی

ذمہ دارتم ہوگی، والد صاحب زنانخانے میں بہت دبے پاؤں آتے تھے کہ آہٹ بھی محسوس نہیں ہوتی تھی، والدہ کی آنکھ اور کان اکثر دروازہ پر لگی رہتی والد صاحب کے آتے ہی چیچ میرے آگے رکھ دیتیں اور سمجھتیں کہ والد صاحب نے محسوس نہیں کیا، والد صاحب مسکراتے ہوئے کمرے میں چلے جاتے۔

کبھی کبھار والد صاحب سے جھگڑتیں بھی کہ اپنی وکالت سنبھالیے اور کچھ انتظام کیجیے دن بھر لیٹے لیٹے شاعری لکھتے رہتے ہیں، یہ کرایہ کے مکان میں اب کب تک رہیں گے، والد صاحب اس پر کھسیانی سی ہنسی ہنستے رہتے، چند سال بعد والدہ نے گھر کے خرچ اور اپنے زیوارت بیچ کر زمین کا انتظام کیا اور اسی پر جاوید منزل کی عمارت بنی، جب ہم اس گھر میں منتقل ہوئے تو والدہ بیمار ہی تھیں دوسرے روز ان کی حالت بگڑ گئی، والد صاحب کچھ کاغذات لے کر آئے اور والدہ سے کہا کہ یہ مکان جاوید کو ہبہ کر دو، والدہ اس پر راضی نہ ہوئیں؛ مگر پھر بھی اس مکان کو میرے نام ہبہ کر دیا اور پانچویں روز ہمیں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

جب میں پہلی دفعہ اسکول گیا تو والدہ بہت ہی پریشان تھیں، والد صاحب تسلیاں دیتے اور خود علی بخش سے پوچھتے رہتے کہ جاوید کو اسکول سے لینے کب جاؤ گے۔

مجھے موسیقی کا بہت شوق تھا؛ مگر گھر میں نہ ریڈیو تھا نہ گراموفون، گانا سننے کا شوق تو والد صاحب کو بھی تھا جب بھی فقیر نجم الدین گھر پر طاؤس بجا کر سناتے تو مجھے بھی پاس بٹھا لیتے، ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے تو میں نے انہیں خط لکھا کہ واپسی پر گراموفون لے کر آیئے گا، والد صاحب گراموفون تو نہ لا سکے البتہ انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط مندرجہ ذیل نظم کے ورود کا باعث ضرور ہوا۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اپنا گریباں چاک/۱۵تا۲۴/جاوید اقبال

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی روپے سے بے رغبتی

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ لکھتے ہیں کہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں جب تھا تو ایک روز تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچا کہ جولوگ سونا اور چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں قیامت کے دن ان کی پیشانیوں کو اسی سونے اور چاندی سے داغا جائے گا، تو قلب اور دماغ پر بجلی گر پڑی، یقین کیجئے اس دن میرے تحت الشعور میں روپے پیسے کی جانب سے بے رغبتی اور کم مقداری کا احساس جان گزیں ہوگیا، ایک عربی شاعر کس فخر سے کہتا ہے:

لا یالف الدرھم المضروب صرتنا

لا یاتیہ الا وھو منطلق

ٹکسالی سکہ ہماری تھیلی سے مانوس نہیں ہے، وہ اس میں داخل ہوا نہیں کہ باہر نکل جاتا ہے۔

مولانا اکبر آبادیؒ جب سیرت کانفرنس کے لئے پاکستان تشریف لے گئے، تو ان کے دو شاگرد مسٹر محمد ایوب رومانی اور سید یمین الدین حنفی نے ملاقات کی، مولانا لکھتے ہیں کہ یہ میرے جارج اسٹیفن کالج کے عزیز شاگرد تھے، جب میں وہاں لیکچرر تھا، میں نے اپنے شاگرد لڑکوں اور لڑکیوں سے اپنی اولاد کی طرح محبت کی ہے بدلہ میں اولاد والی محبت ہی ملی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب میرا نام انہوں نے ریڈیو پر سنا تو ملنے کے لئے دوڑے چلے آئے، جب ان سے مل کر واپس ہوا تو انہوں نے پانچ سو روپئے ایک لفافہ میں رکھ کر نذر کیے، میں نے اپنی عادت کے مطابق ہر چند معذرت کی؛ مگر وہ نہ مانے اور بولے لاہور میں جو آپ کی بچی اور ان کے بچے ہیں ان کو دے دیجئے گا، میں نے واقعی ایسا ہی کیا اور یہ پیسہ فطرتاً میں اپنے پاس رکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

ماہنامہ برہان/۱۹۷۶

علامہ اقبالؒ

والدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب (ڈاکٹر اقبال) نے خضاب لگانا بالکل ترک کر دیا تھا، بال بالکل سفید ہو چلے تھے، ایک روز میں نے کہا اب آپ پھر خضاب لگانا شروع کر دیجئے، بولے: اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مگر میں نے کہا کہ ہم آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں، ہماری خواہش پر وہ چند مرتبہ خضاب لگائے اس کے بعد پھر چھوڑ دیئے۔

مجھے مصوری کا بہت شوق تھا؛ لیکن والد محترم کا اس کا علم نہ تھا، ایک مرتبہ ایک

تصویر کچھ اچھی بن گئی، ان دنوں تایا جی لاہور آئے ہوئے تھے انہیں وہ تصویر بہت اچھی لگی وہ اسے والد صاحب کو دکھلانے لے گئے، جسے دیکھ کر انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ تصویر میں نے بنائی ہے اور جب یقین آگیا تو فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے آرٹ کی کتابیں منگوائیں، جب میں نے مصوری کے ان شاہکار کو دیکھا تو اپنی ہمت جواب دے گئی کہ پوری زندگی اگر محنت ومشقت کروں گا تب بھی ایسی تصویر نہ بنا سکوں گا۔

والد صاحب کو جوانی میں کبوتر بازی کا بہت شوق تھا، ان کی تمنا تھی کہ گھر کی چھت پر کبوتروں کو چھوڑ دیا جائے اور چارپائی انہیں کے درمیان میں رہے۔ انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لئے مفید ہوتی ہے۔

والد صاحب کے عقیدے مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار آتے تھے اور والد محترم کو قرآن سناتے تھے، جب وہ قرآن سناتے تو مجھے بھی والد صاحب اپنے پاس بٹھا لیتے، ایک مرتبہ انہوں نے سورہ مزمل کی تلاوت فرمائی، والد محترم کے آنسوؤں سے تکیہ تر ہو گیا، جب وہ ختم کر چکے تو مجھ سے فرمایا کہ تمہیں بھی قرآن اسی طرح پڑھنا چاہئے، اسی طرح مجھ سے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو کہا اور خاص طور پر وہ بند۔۔۔ جب قریب بیٹھے ہوئے مرزا محمد شفیع نے دہرایا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے، میں نے انہیں والدہ کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؛ مگر قرآن مجید سنتے یا رسول اللہ کا اسم گرامی کسی کی نوک زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

مجھے والد صاحب نے کبھی نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کے لئے نہیں کہا ایک مرتبہ

مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنی مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے کہا:

سحر جاوید را در سجدہ دیدم
بہ صبحش چہرۂ شامم بیارائی

ارمغان حجاز

انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں پلنگ پر سونے کے بجائے زمین پر سویا ہوں تو بہت خوش ہوتے۔

والد صاحب کے لئے ہندوستان بھر سے افغانستان سے آموں، انگوروں، سیبوں اور سردوں کی پیٹیاں آیا کرتی تھی، جب ملازم پیٹیاں کھول کر بتاتے کہ آم آئے ہیں یا سردے آئے ہیں تو منیرہ دوڑ کر والد کے کمرے میں جا کر بتاتی کہ آم آئے ہیں، سردے آئے ہیں، ایک مرتبہ سر سید مراتب علی کے فرزند سید واجد علی اور سید امجد علی والد صاحب سے ملنے آئے، ان کی اسٹیشن ویگن میں بہت سے کتے تھے، منیرہ کتوں کو دیکھ کر بھاگتے ہوئے والد صاحب کے پاس گئی اور کہا کہ کتے آئے ہیں، والد صاحب کی رگ ظرافت بھڑک گئی اور کہا بیٹی ! یہ سب انسان ہیں۔

اپنا گریباں چاک/۳۳تا۴۰۔ جاوید اقبال

گاندھی جی کی خوراک

جب گاندھی جی لاہور تشریف لے گئے تھے تو ایک باخبر نامہ نگار نے گاندھی جی کی خوراک کی تفصیل لکھی جو ان دنوں کھاتے تھے۔

چار بجے صبح: آدھ سیر گرم پانی، چھ چمچے شہد، بیس گرین سوڈا بائی کارب

ساڑھے پانچ بجے صبح: بکری کا آدھ سیر دودھ، آدھ سیر تازہ انگور۔

آٹھ بجے صبح: آدھ سیر گرم پانی، چھ چمچے شہد، بیس گرین سوڈا بائی کارب۔

ساڑھے چار بجے شام: آدھ سیر سبزی، آدھ سیر آم کا رس، دو چھٹانک تازہ انگور۔

ساڑھے پانچ بجے شام: آدھ سیر سبزی، آدھ سیر آم کا رس، آدھ سیر تازہ انگور۔

کبھی کبھی اس خوراک کے ساتھ ہی آدھ سیر شیرہ بادام بھی نوش فرماتے تھے، میں نے افکار و حوادث میں اس خوراک سے اس غذا کا مقابلہ کیا، جوان دنوں میں کھا رہا تھا اور بتایا کہ گاندھی جی کی خوراک میری خوراک سے وزن میں چوگنی اور غذائیت میں خدا جانے کتنے گنا زیادہ قوی ہے، اس لیے لوگوں کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہئے کہ گاندھی جی کم خوراک کھاتے ہیں، وہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے خوب کھاتے ہیں۔

سرگزشت/۳۲۳۔عبدالمجید سالک

اقبال پر سمندر کا اثر

جہاز کے سفر میں دل میں سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے، باری تعالیٰ کی قوت لاانتہا کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو، حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے، جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے، آج ۲۱ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح میں بہت سویرے اٹھا ہوں، جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں، چراغوں کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے، آفتاب چشمہ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسے ہمارا دریائے راوی، طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لیے تلاوت کا علم رکھتا ہے۔"

اپنا گریباں چاک/۲۸۔جاوید اقبال

جذب وشوق

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معمور ایک عاشق (علامہ اقبال) جسے حج بیت اللہ تو میسر نہ آ سکا مگر ساحل عرب کی قربت نے جذب وشوق کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

"اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو تو ایک پتھری تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا؛ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا فسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی، اے پاک سرزمین! تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے، کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور میری آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذان بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

اپنا گریباں چاک/۶۹۔ جاوید اقبال

اقبال کا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات کے بعد ہی لوگوں میں شائع ہوئے، ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سرصاحبان" ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی ہوں گے؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے، ایک واقعہ پڑھ لیجئے جس سے اس

نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ لگا سکیں گے۔

"پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کیلئے اقبال اور سر فضل حسین اور ایک دو مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں انکے قیام کا انتظام کیا، رات کو جس وقت اقبال نے اپنے کمرے میں آرام کرنے کیلئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً انکے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسولؐ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہمیں یہ مرتبے حاصل ہوئے ہیں، اس نے بوریے پر سو کر زندگی گذار دی تھی، یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور ہچکی بندھ گئی، اسی بستر پر لیٹنا ان کیلئے ناممکن ہو گیا، اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلوا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اسی غسل خانے میں بچھوائی، جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانے ہی میں سوئے، یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے، جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے، وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی وفقیری کا اشتہار دیتے ہیں اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہم دردی کا دم بھرتے ہیں؛ مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے۔

جوہر اقبال/۹۸۔ محمد حسنین سید

استحصال کا جواب

"قتیل شفائی اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں کہ: جگن ناتھ آزاد کے اعزاز میں پنڈی کے ایک رئیس نے چائے کا انتظام کیا اور مشاعرے میں جو دوسرے شاعر آئے

ہوئے تھے ساتھ انہیں بھی بلالیا، اس نے یہ قطعاً تاثر نہیں ہونے دیا کہ اس کے کوئی اور مقاصد بھی ہیں۔

جب ہم چائے پی چکے، میں اور جگن ناتھ آزاد ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، تو میزبان کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ اب کچھ ارشاد فرمایئے، میں نے اشارۃً کچھ کہا کہ ہمیں تو چائے پر بلایا گیا تھا، اس لئے میں تو ذہنی طور پر کچھ سنانے کے لئے تیار نہیں ہوں، لیکن کچھ لوگوں کو سنانے کی عادت ہوتی ہے، چنانچہ انہوں نے سنانا شروع کیا، ہم کوئی سات آٹھ شاعر تھے، جب میری باری آئی تو میں نے جیب سے دو روپے نکالے اور میزبان سے کہا یہ لیجئے جناب وہ کہنے لگے یہ کیا ہے، میں نے کہا: چائے کی قیمت، کیوں کہ چائے پلا کر شعر نہیں سنے جا سکتے؛ اگر آپ کو شعر سننا ہے تو معاوضہ نکالئے، یہ جگن ناتھ آزاد باہر سے آئے ہیں، یہ ان پیسوں سے کچھ خرید و فروخت کریں گے، پھر ہم لاہور سے آئے ہیں ہماری بھی کچھ ضرورتیں ہیں، آپ دو روپے کی چائے پلا کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم سے کلام سنیں گے، تو یہ دو روپے رکھ لیجئے۔

میری ان باتوں سے بدمزگی پیدا ہوگئی، کچھ خوشامدیوں نے کہا کہ یہ نہیں کرنا چاہئے تھا؛ لیکن اکثریت خوش ہوئی جگن ناتھ آزاد نے اس واقعہ پر مجھے بہت داد دی۔

گھنگھرو ٹوٹ گئے/۱۸۶

ہجرت کے تجربے

(۱)

جب تقسیم ہوئی تو ہندوؤں کی مسلمانوں سے چھوت چھات کی نفرت عروج پر تھی، ہری پور گاؤں میں ایک مہتا فیملی تھی جس کا سربراہ ہیمراج تھا، میری فیملی (قتیل شفائی)

اس کی مد مقابل ہوتی تھی، جو سب سے پہلے پگڑی باندھ کر لاٹھی ہاتھ میں لیے نکلتا تھا، یہ سلسلہ قیام پاکستان تک رہا، ۱۹۵۲ء میں پہلی بار میں دہلی گیا تو چاندنی چوک پر ایک شخص ملا، اس کے لباس اور چہرے سے پہچان لیا کہ یہ ہری پور کا رہنے والا ہے، اس نے میرا اصلی نام لے کر پوچھا کہ مجھے پہچانا، میں نے کہا جی اتنا پہچانا کہ ہری پور کے رہنے والے ہیں، اس نے بتایا کہ میں مہتا ہیمراج کی فیملی سے ہوں، آپ ہمارے گھر آیئے، میں پریشان تو ہوا کہ ان کے ساتھ اتنے لڑائی جھگڑے تھے، مگر دعوت قبول کر لی، انہوں نے میرا ایڈریس لیا اور اگلے روز ان میں سے کوئی آیا اور مجھے لے گیا، میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ ہری پور کے رہنے والوں میں سے کچھ لوگوں نے وہاں پر بھی مکان ایک ساتھ الاٹ کروائے ہیں اور ان کا رہن سہن بھی ہری پور والا ہے، عورتیں مرد سب جمع تھے، مجھے دیکھنے کے لئے وہ ایسے آئے جیسے پیر کو دیکھنے آئے ہوں اور مجھ سے نام لے لے کر ایک ایک شخص کے بارے میں پوچھتے رہے، پھر پوچھا اس مندر کا کیا حال ہے، اس مکان میں کون رہ رہا ہے اور ہمارا باغ کس کو الاٹ ہوا ہے؟ اور ہر شخص نے جب اپنی حیثیت کے مطابق تحفہ پیش کیا تو میں کچھ جذباتی ہو گیا، اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اتنی عداوتوں کے باوجود جب بیچ میں ہجرت کا تجربہ پیش آیا تو اپنے دشمن انہیں اچھے نظر آنے لگے، جب تضادات کا ٹکراؤ آ جاتا ہے تو پھر کچھ تلخیاں پیدا ہوتی ہیں کچھ محبتیں۔

(۲)

قیام پاکستان سے پہلے جب میں مری سے ٹرانسپورٹ کی نوکری چھوڑ کر لاہور آیا اور یہاں ''ادب لطیف'' کی ملازمت کی تو یہاں فکر تونسوی میرے ادارے کے ساتھی اور دوست بنے، بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ہندو تھے، ان کا نام رام لال بھاٹیہ تھا، اسی

طرح فکر تونسوی کی بیوی کو نہیں معلوم تھا کہ قتیل شفائی مسلمان ہے، وہ مجھے ہندو سمجھتی تھی، ایک دن فکر نے مجھ سے کہا تم کھانا میرے گھر پر کھاؤ، چنانچہ میں ان کے گھر چلا گیا، یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے، فکر بیوی کو پیار سے میم کہتے تھے، لیکن اس نام میں جتنی جدت تھی اس خاتون میں اتنی ہی قدامت تھی، بالکل دیہاتن تھی، فکر تونسوی تھال میں کھانا رکھ کر میرے لیے لایا، وہ بڑا آزاد خیال آدمی تھا، وہ ہندو اس طرح تھا کہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا، بالکل اس طرح جیسے ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔

فکر نے اپنی بیوی سے کہا: یہ بتاؤ کہ قتیل شفائی کون ہیں؟ وہ نہیں سمجھی اور کہا کہ آپ کے دوست ہیں، اس نے کہا: نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ ہندو ہیں یا مسلمان ہیں؟ کہنے لگی کہ ہندو ہیں، وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا کہ بھول گئی نا یہ تو مسلمان ہے، اس بات پر اسے بہت حیرت ہوئی، چہرہ اتر گیا، مجھے سمجھ نہیں آیا کہ یہ مسلمان کہنے سے پریشان کیوں ہوئی، خیر جب وہاں سے کھانا کھا کر نکلے فکر نے کہا دیکھا میری بیوی کا کیا حال ہوا، تو یہ حال ہے آج کل ہندو مسلم نفرت کا۔

پھر جب میں ۱۹۵۲ء میں دہلی گیا تو فکر نے مجھ سے کہا کہ چلو گھر چل کر میری میم سے ملو، ہمارے بہت قریبی تعلقات تھے اس لئے میں ان کے گھر گیا وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ میم کی صورت کی کچھ اور ہے، مجھ سے کہنے لگی کہ قتیل صاحب آپ کھانا ہمارے یہاں کھائیں گے، میں آپ کو میٹ پکا کر کھلاؤں گی، میں نے کہا بھابھی تمہیں کیا ہو گیا ہے تم تو دال ساگ سے آگے نہیں جاتی تھی، اب تم میٹ بناؤ گی کہنے لگی ہاں بناؤں گی، خیر گوشت پکانے کا طریقہ تو اسے کیا آتا تھا، بس اس میں خلوص ہی تھا، خیر اس نے میٹ بنایا بھی اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھایا بھی۔ گھنگھرو ٹوٹ گئے ر۱۰۳

چو مرگ آید تبسم برلب اوست

طبیعت میں سستی اور اضطراب و بے چینی کی وجہ سے احمد بن عمرو بن سریج آج بمشکل عشا کی نماز پڑھ سکے، تھکن اور ناسازگی طبع نے انہیں اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ آج بستر پر دراز ہو جائیں؛ لیکن ان کا ضمیر اس پر تیار نہیں تھا، اس لئے وہ حسب معمول اپنے دیگر معمولات پورے کرنے کے بعد ہی لیٹے اور لیٹتے ہی نیند نے انہیں اپنے آغوش میں لے لیا اور وہ کسی دلچسپ منظر کے نظارہ میں محو ہو گئے، تمہارا پروردگار تم سے مخاطب ہے، اچانک ایک آواز ان کے پردہ گوش سے ٹکرائی اور انہوں نے اس آواز کی طرف کان لگا دیا، جو ان سے کہہ رہی تھی:

"ہمارا فرستادہ تمہارے پاس آیا، اس نے تم کو ہمارا پیغام پہنچایا تو تم نے اس پر لبیک کس طرح کہا؟

"ایمان وتصدیق کے ذریعہ احمد بن عمرو بن سریج نے جواب دیا"

پیغمبر نے جو دعوت تم کو دی تم نے اس پر کس طرح عمل کیا؟ آواز پھر بلند ہوئی۔

احمد سمجھے شاید میرا جواب تشنہ رہ گیا، اس لئے انہوں نے یوں جواب دیا:

"ہم نے آپ کے پیغمبر کی دعوت پر ایمان وتصدیق کے ذریعہ ہی عمل کیا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم سے کچھ کوتاہیاں ہوئیں، ہم گناہ کے بھی مرتکب ہوئے، ہم معافی کے طلبگار ہیں"۔

جاؤ ہم نے تمہیں معاف کیا، جنت کی حوریں تمہارا انتظار کر رہی ہیں، وہی جانی پہچانی آواز پھر فضا میں گونجی، پھر مکمل سکوت طاری ہو گیا اور احمد فرط مسرت سے بیدار ہو گئے، فرشتہ اجل کھڑا مسکرا رہا تھا، ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ طاری ہوئی اور پھر اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا۔

طبقات الشافعیہ الکبیر ج۲، ص۸۰،
تعمیر حیات ۱۹۶۵ء

موٹی جوں

ایسے پاک نہاد خانقاہ نشیں، گدا صورت شاہ باطن لوگوں کی نظر میں، بادشاہان دنیا کی کیا وقعت تھی، سننے کی بات ہے لکھا ہے کہ:

اورنگزیب عالمگیرؒ جو مغلیہ سلطنت کے ہار کا درمیانی موتی ہے، فقراء گنج نشیں کے یہاں حاضری سعادت سمجھتا تھا، ایک سفر کے درمیان لاہور سے گزرا یہاں کے مشہور بزرگ میاں میرؒ سے ملاقات کرنے کے لئے خانقاہ میں وارد ہوا، میاں میرؒ دھوپ میں بیٹھے مریدوں کے حلقہ کے درمیان اپنی گدڑی میں جوئیں تلاش کر رہے تھے، عالمگیرؒ کی آمد کا غلغلہ ہوا تو مریدوں کے حلقہ میں کھلبلی سی مچ گئی، افراتفری کو محسوس کرتے ہوئے میاں صاحبؒ نے دریافت کیا، خیر بھی ہے؟ باصفا لوگوں کی جماعت سے آواز اٹھی، کہ عالمگیرؒ شہنشاہ ہندوستان زیارت کے لئے آتے ہیں، مسکرا کر فرمانے لگے:

''لاحول ولا قوۃ! میں تو سمجھتا تھا کہ کوئی فربہ جوں ہاتھ لگی''۔

سنا ہے کہ عالمگیرؒ سے کسی نے اس کا ذکر کیا تو یہ روشن ضمیر بادشاہ بے ساختہ بولا کہ: ہاں! بھائی ان لوگوں کی نظر میں ایک موٹی جوں بھی عالمگیرؒ سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

نانِ جویں

عباسیوں کے دورِ حکومت کا نامی گرامی امیر ابو دلف کے صاحبزادے دلف حضرت قبیصہ ابن عامرؒ کے دروازے پر حاضر ہوئے لوگوں نے اندر اطلاع کرائی؛ لیکن قبیصہؒ پر اثر تک نہ ہوا، مسلسل انتظار کے بعد لوگوں نے قبیصہؒ کے قریب جا کر کہا:

''جبل نامی صوبہ کے بادشاہ کا بیٹا دروازہ پر کھڑا ہے اور آپ باہر بھی نہیں نکلتے''

دنیا پرست لوگوں نے جب ہنگامہ گرم کیا تو قبیصہؒ گھر سے نکلے، اس طور پر کہ چادر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا تھا اور دلف سے کہہ رہے تھے کہ:

''من رضی من الدنیا بھذا ما یصنع بابن ملک الجبل. جو دنیا کے اس قلیل حصہ پر قناعت گزیں ہو گیا اسے دلف کے بیٹے کی کیا پرواہ''

ماہنامہ دارالعلوم۔بحوالہ ذہبی ر۳۴۰

قلیل حصہ پر قناعت اختیار کرنے کے بعد واقعہ یہ ہے کہ دنیا اور اہل دنیا کی حیثیت پرِ کاہ سے بھی زیادہ نہیں رہتی۔

مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی شاہ کلید

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیا کچھ نہیں تھے، آپ بلند پایہ مفکر، زبردست داعی الی اللہ، شہرۂ آفاق مصنف، مؤرخ، مفسر، ادیب و انشاء پرداز، سحر بیان مقرر و خطیب اور ممتاز ترین مربی و عالم ربانی تھے؛ لیکن میری نظر میں ان کی شخصیت کی شاہ کلید دعوت الی اللہ ہے، ان کا دعوتی پہلو تمام دوسرے پہلوؤں پر حاوی اور غالب ہے، وہ سیرت نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو تاریخ اسلامی کی ان شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی حیات

اور کارناموں میں دعوت وعزیمت کا پہلو بہت نمایاں ہے، ''السیرۃ النبویۃ'' لکھتے ہیں تو حیات نبوی کے دعوتی پہلو کو سب سے زیادہ اجاگر کرتے ہیں، نصابی کتابیں مرتب کرنے میں انبیاء کرام کے ایمان افروز قصوں کو اپنی توجہات کا مرکز بناتے ہیں اور قصص النبیین جیسی البیلی کتاب وجود میں آتی ہے، جسکی سطر سطر میں ادب کی چاشنی اور دعوت کی تڑپ ہے، مختارات میں ادب عالی کا انتخاب کرنے بیٹھتے ہیں تو عربی ادبیات سے ایسے شہ پارے تلاش کر کے لاتے ہیں، جن میں دعوتی برق و رعد پنہاں ہیں، ''ماذا خسر العالم'' میں امت مسلمہ کے عروج وزوال کی داستان سناتے ہیں تو امت مسلمہ کا اس کو اس کا کھویا ہوا داعیانہ و قائدانہ مقام یاد دلاتے ہیں، ہندوستان کے مقامی حالات میں ان کا داعیانہ ذہن ''پیام انسانیت'' کے نام سے ایک نیا عنوان تراشتا ہے اور پیام انسانیت کے غلاف میں اسلام کی دعوت برادران وطن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، غرضیکہ ان کی تمام تحریروں اور تحریکوں میں دعوت کی روح رچی بسی ہوئی ہے، اس لئے میرے خیال میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سب سے اول اور سب سے آخر میں جلیل القدر عالم ربانی اور داعی الی اللہ تھے، ان کے سارے کاموں اور کارناموں کو اگر ہم ایک لفظ میں کشید کر لینا چاہیں تو وہ لفظ ''دعوت'' ہے۔

تعمیر حیات مفکر اسلام نمبر ۱۹

ستارے مٹھی میں

جاوید اقبال سفر چین کے دوران چین کی دیوار دیکھنے گئے تو سات آٹھ سال کی ایک چینی بچی بھی ان کے ہمراہ گئی تھی جس کی باتیں انھوں نے اپنے ڈائری میں محفوظ کر لیں۔

راستے میں میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے پوچھا: کیا آپ کے ہاتھوں میں ستارے ہیں؟ میں نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے، کہنے لگی:

آپ کے ہاتھوں میں ستارے نہیں؛ کیونکہ آپ مزدوری کے لیے اپنے ہاتھ استعمال نہیں کرتے، پھر اس نے اپنے ہاتھ کھول کر مجھے دکھائے جن میں مشقت کے سبب گٹھے پڑے ہوئے تھے، میں نے پوچھا، ستارے آپ کے ہاتھوں میں کیسے آ گئے؟ اس نے جواب دیا، میں اپنے اسکول میں پڑھائی کے بعد روز تین گھنٹے زمین کی گوڈی کرتی ہوں، اس میں پھل ڈالتی ہوں، سبزیاں اگاتی ہوں، انہیں پانی دیتی ہوں، میرے ہاتھوں میں ستارے اسی مزدوری کا انعام ہیں، پھر میں نے پوچھا، ''اگر بارش نہ ہو تو کیا آپ دعا مانگتی ہیں؟'' کہنے لگی، دعا مانگنا تو بھیک مانگنا ہے، ہم لوگ کسی سے کچھ نہیں مانگتے بلکہ اپنے بازوؤں کے زور سے خود زمیں کھود کر پانی نکال لیتے ہیں۔

اپنا گریباں چاک/۱۳۱۔ جاوید اقبال

نوٹ۔ اس تحریر کو عقیدہ کی نظر سے نہ دیکھا جائے، ہمارا عقیدہ تو وہی جو کہ پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچا اور ہم نے اسے سچے دل تسلیم کیا اور اقرار کیا، ہمارے لئے خدا سے رابطہ بھی ضروری ہے، اسی سے مدد بھی طلب کرنی ہے اور اسی کی تلقین بھی ہے، قوت بازو پر اتنا بھروسا اور اعتماد، مگر بازوں میں قوت کس نے پیدا کی اس سے غافل، یہ تو آٹھ سال کی بچی ہے اس راز کو تو بڑے بڑے مفکرین نہ سمجھ سکے، انہیں کے بارے میں کہا گیا ہے کیا وہ عقل و ہوش نہیں رکھتے ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا

اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا

آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شب تاریک سحر

محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری

عبدالقیوم شہیدؒ اور علامہ اقبالؒ

فقیر سید وحید الدین صاحب نے عبدالقیوم شہید کا واقعہ پوری تفصیل سے لکھا ہے، نتھورام نے ایک کتاب ''تاریخ اسلام'' کے نام سے انگریزی میں شائع کی تھی اور اس میں حضور کی شان اقدس میں انتہائی گستاخیاں کی تھیں، مسلمانوں نے شاتم رسول پر مقدمہ قائم کیا؛ مگر کچھ نہ بنا، ہزارہ کا ایک نوجوان عبدالقیوم نامی کراچی میں وکٹوریہ چلاتا تھا، اس نے سنا تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی، ایک دن عین مقدمہ کی سماعت کے دوران وہ اپنا تیز دھاردار چاقو لے کر نتھورام پر حملہ آور ہوا اور اس کی گردن پر پیہم بھرپور وار کیے، جس سے نتھورام اسی وقت واصل جہنم ہوا۔

مسلمانوں نے عبدالقیوم شہید کے مقدمہ کی ہائی کورٹ تک پیروی کی؛ مگر سزائے موت ہر جگہ بحال رہی۔

فروری ۱۹۳۵ء میں کراچی کے مسلمانوں کا ایک وفد حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی خدمت میں لاہور پہنچا اور میکلوڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مقدمہ کی روداد تفصیل سے سنائی، اس کے بعد عرض کیا کہ آپ وائسرائے سے ملاقات کریں اور اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لائیں اور انہیں اس پر آمادہ کریں کہ غازی عبدالقیوم کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی جائے۔

علامہ وفد کی یہ گفتگو سن کر دس پندرہ منٹ تک بالکل خاموش رہے اور گہری سوچ

میں ڈوب گئے، وفد کے ارکان منتظر اور مضطرب تھے کہ دیکھئے علامہ کیا فرماتے ہیں، توقع بھی تھی کہ جواب اثبات میں ملے گا، کہ ایک عاشق رسول کا معاملہ دوسرے عاشق رسول کے سامنے پیش ہے، اس سکوت کو علامہ اقبال ؒ ہی کی آواز نے توڑا، انہوں نے فرمایا:

کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟۔

"ارکان وفد نے کہاں "نہیں" اس نے تو ہر عدالت میں اپنے اقدام کا اقبال اور اعتراف کیا ہے، اس نے نہ تو بیان تبدیل کیا اور نہ لاک لپیٹ اور ایچ پیچ کی کوئی بات کہی، وہ تو کھلے خزانے کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے، مجھے پھانسی سے بچانے کی کوشش مت کرو۔

وفد کی اس گفتگو کو سن کر علامہ کا شہرہ تمتما گیا، انہوں نے برہمی کہ لہجہ میں فرمایا "جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر وثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لئے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی اور مر گیا تو شہید ہے"۔

"علامہ کے لہجے میں اس قدر تیزی اور تختی تھی کہ وفد کے ارکان اس سلسلہ میں پھر کچھ اور کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اقبال اور محبت رسول ۸۷/ ڈاکٹر طاہر فاروقی

غربت اور غریب الوطنی، حسان دانش اور اسحاق شور

دو بچوں کے جنازے اور والدین کی بے کسی

محمد اسحاق شور بابری (ضلع مظفر نگر) کے رہنے والے نہایت خوش اخلاق، یار

باش، بے تکلف اور سادہ لوح انسان ہیں ایک بار ملئے تو معلوم ہوگا کہ برسوں سے تعلقات چلے آتے ہیں، اپنی طرف سے بات نبھانے میں کوشاں، مگر دنیا کو سمجھنے میں مجھ سے بھی زیادہ نا اہل، وہ اپنی طرح ہر شخص کو بے ریا خیال کرتے ہیں، یہ احسان دانش کے بے تکلف دوست ہیں۔

جب احسان دانش کی اسحاق شور سے ملاقات ہوئی تو اس وقت دونوں لاہور میں اجنبی تھے اور وہی چیز انہیں قریب لائی، یہاں احسان دانش نے انہیں اہل وعیال سمیت اپنے مکان میں بلا لیا، تاکہ تنہائی کا احساس نہ رہے۔

ایک دن شور نے ان سے کہا کہ وضع حمل ہونے والا ہے، پیسہ پاس نہیں ہے کیا کروں؟ احسان دانش نے کہا کہ فکر نہ کرو اہلیہ کو اسپتال میں داخل کرا دو، وہ اسپتال پہنچا دی گئیں، دوسرے دن شور خوشخبری لائے کہ دو لڑکے تولد ہوئے ہیں، احسان دانش نے مبارکباد کے ساتھ ساتھ قہقہہ لگاتے ہوئے یہ کہا کہ زنجیر میں قدرت کی طرف سے مصائب کے ساتھ ساتھ دو کڑیاں اور بڑھ گئیں۔

اب آپ آگے پڑھئے:

ان دنوں احسان دانش اور شور اس قدر نزدیک تھے کہ ایک دوسرے سے زندگی کا کوئی گوشہ بھی چھپا نا گناہ معلوم رہتا تھا، روز ملنا اور زندگی کی تلخیوں کو قہقہوں میں اڑا دینا معمول سا بن گیا تھا، دوسرے یا تیسرے روز جب لاہور میں گرمیوں کا آفتاب سڑکوں سے سایوں کی جاجمیں سمیٹ دیتا ہے شور صاحب تشریف لائے جیسے کسی پٹواری کی لال کتاب گم ہوگئی ہو، پھر بولے ''بھائی جان! دونوں بچوں کا انتقال ہوگیا ہے، اب دو لاشیں ہیں اور ہم دو آدمی کس کو بلائیں اور کیا کریں؟ میں نے کہاں کرنا کیا ہے چلو دفنا دیں، کتنی رقم ہے

تمہارے پاس،؟

شور: چار روپے اور تمہارے پاس؟

میں: دو روپے چھ آنے۔

شور: اس رقم میں دو لاشیں دفنائی جا سکتی ہیں؟

میں: لاشیں تو بغیر پیسے کے بھی ٹھکانے لگائی جا سکتی ہیں۔

شور: آؤ پھر جلدی چلو آدمیوں کو بھی اکٹھا کرنا ہے۔

میں: کاہے کو؟

شور: کاہے کو؟ ارے بھائی دو جنازے لے جانا ہے۔

میں: ارے میاں! یہ تو سوچو کہ اس برستی آگ میں کون ہمارے ساتھ جانے لگا؟ کون سے یاں عزیز و اقارب بیٹھے ہیں، تم دو گز کپڑا لے لو اور خاموشی کے ساتھ مجھے لے چلو؛ اگر ہنگامہ کرنا ہے تو بندے کو معافی دو، میں اپنا وقت کیوں خراب کروں، اپنا کام کروں گا۔

شور: نہیں بھئی، جو آپ کہیں اس میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے، آخر کسی طرح اس مصیبت کو تو ٹالنا ہی ہے۔

میں اور شور دونوں اسپتال گئے اور نرس نے دونوں بچوں کی لاشیں ہمارے سپرد کر دیں، میں نے شور کے لائے ہوئے دو گز لٹھے کے ایک ایک گز کے دو ٹکڑے کر لئے اور ایک ایک لاش کو ایک ایک پارچہ میں لپیٹ کر ایک کو سائیکل کے اگلے کیریر اور دوسرے کو پچھلے کیریر پر باندھ لیا اور دونوں جنازہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے، ایک بار تو شور کے چہرے پر استعجاب کی پرچھائیں کانپی؛ لیکن فوراً مسکراتا ہوا میرے ساتھ ہو لیا، راستے میں جس شخص

نے دیکھا وہ دور تک دیکھتا رہا اور بعض اس حقیقت کو خواب سمجھنے کے لئے تھوڑی دور تک ساتھ چلے اور ''توبہ'' ''توبہ'' کہہ کر کانوں پر ہاتھ دھرے واپس ہو گئے، کسی نے کہا ''اللہ اللہ! کیا بے بسی ہے'' کسی نے ہاتھ ملے اور کوئی منہ پھیر کر دہلیز میں گھس گیا، ہم تھے کہ خوش خوش ایک دوسرے کا دل بہلاتے اور آگے کے اوقعات کا اندازہ کرتے چلے جا رہے تھے، آخر کار جنازہ گاہ آ گئی اور ہم نے دونوں لاشیں سائیکل سے کھول کر فرش پر رکھ دیں جہاں نماز جنازہ ہوتی ہے۔

بچوں کی لاشیں دیکھ کر ایک گورکن دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: ''میاں صاحب کہاں دفن کرو گے؟''

میں: بھائی جہاں جگہ ہو دفن کر دو۔

گورکن: دونوں قبروں کے دس دس روپے ہوں گے۔

میں نے اسحاق شور کی طرف دیکھا کیوں کہ دس روپے تو ہم دونوں کی پونجی ملا کر بھی نہیں ہوتے تھے، شور خاموش ہو گیا اور ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگا ''تم ہی جانو جو چاہو کرو''

میں نے گورکن سے کہا بھئی دو قبروں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو بھائی بھائی ہیں لڑیں گے تو نہیں، ایک ہی جگہ کسی چھوٹی سی قبر میں دفنا دو، اتنے میں ایک مولوی صاحب اندر کی محراب سے اٹھ کر آئے غالباً وہ اسی جنازہ گاہ کے عملے کے کارکن تھے، فرمانے لگے، سنو جی! اگر بچہ جنتے ہوئے عورت کا انتقال ہو جائے تو بچہ ہمراہ دفن ہو سکتا ہے ورنہ ہر جسم کی قبر علحدہ ہوتی ہے سمجھے؟''

میں: حضرت! پھر آپ ان دونوں بچوں کی لاشوں کو امانت رکھیں ہم ہسپتال سے ان کی ماں کو ابھی مار کے لاتے ہیں، پھر تینوں کو ایک ہی جگہ دفن کر دیجئے، دس روپے تو

ہمارے پاس نہیں اور نہ کہیں سے مہیا ہو سکتے ہیں“۔

مولوی صاحب: یہ کوئی عجیب بیہودہ لوگ ہیں کہ میت پر کھڑے ہیں اور مذاق کرتے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ ہم لوگوں سے آدمی مرواتے ہیں؟ اور لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے مسجد میں داخل ہو گئے۔

شور: احسان صاحب اب کیا کریں؟

میں: تدبیر تو ہے اور اعلیٰ درجہ کی ہے: لیکن ہمت سے کام لو“

شور: کیا؟

میں: دونوں لاشیں یہاں چھوڑ کر ایک ایک کر کے کھسک چلو، جب شام ہو گی اور کوئی وارث نہیں آئے گا تو انہیں لاشیں خود دفنانا پڑیں گی ار ہم تم سے اچھی طرح دفنائیں گے۔

شور: بات تو بہت زوردار ہے، اس طرح تو پیسے بھی بچ جائیں گے، پہلے آپ کھسک لیں پھر چپکے سے موقع دیکھ کر میں آجاؤں گا۔

یہ گفتگو اختتام پر تھی کہ ایک شخص شفیع نامی جو نہ جانے مجھے کیسے جانتا تھا دور سے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور کہنے لگا احسان صاحب! کیا بات ہے، میں نے تمام ماجرا سنایا اس نے کہا، لاشیں اٹھالو اور آؤ میں اپنی زمین دیتا ہوں۔

ہم دونوں لاشیں لے کر اس کے ساتھ ہو لئے اس نے غالباً چار روپے ہم سے لئے اور ہم نے ایک چھوٹی سی قبر کھود کر دونوں معصوموں کو سپردخاک کر دیا۔

اس مصیبت سے نجات پاتے پاتے شام ہو گئی، میں گھر چلا گیا اور شور ہسپتال کو روانہ ہو گیا؛ تاکہ اہلیہ کو دلاسا دے، وہ کوئی دو گھنٹے کے بعد آیا اور سونے کے وقت تک اس موضوع پر

کوئی بات چیت نہیں ہوئی، مگر شور رہ رہ کر خاموش ہو جاتا اس کی گفتگو میں وہ پہلی سی شگفتگی نہیں تھی، علی الصبح اٹھ کر اس نے ہسپتال جانے کا ارادہ ظاہر کیا، میں نے کہا خیریت ہے؟

شور: ہاں خیریت تو ہے، مگر خیریت کچھ ہمیں پسند نہیں کرتی، جب سے ہم لاشیں ہسپتال سے لے کر نکلے تھے، میری بیوی اسی وقت سے رو رہی ہے، آنکھیں ورم کر گئیں اور آپ سے تو وہ بہت ہی ناراض ہے، مجھ سے کہہ رہی تھی کہ، تم نے بچوں کی لاشیں یزید کے سپرد کر دیں، ایسی بیدردی تو شمر بھی روا نہ رکھا، بھلا کوئی سائیکل پر بھی لاشوں کو لے جاتا ہے؟

میں نے کہا اچھا، میں ساتھ چلتا ہوں ابھی ٹھیک ہوئی جاتی ہے۔

میں اور شور ہنستے بولتے دونوں ہسپتال پہنچے، واقعی اس کی اہلیہ رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی، میں نے پہلے تو اسے سمجھانا چاہا کہ ”دیکھو بہن ہم غریب الوطن ہیں اس تپتی دوپہر میں ہمارا ساتھ دینے والا کون تھا، آخر بچوں کو کسی نہ کسی طرح تو دفنانا تھا ہی، اس کے سوا اور چارہ کار تھا بھی کیا؟“

شور کی اہلیہ جھلا کر بولی ”بھائی کوئی آج تک لاشوں کو سائیکل پر بھی باندھ کر لے گیا ہے؟

میں نے ذرا بگڑ کر کہا ”جب آدمی نہیں تھے تو کیا کرتے ان کے لئے میں ہوائی جہاز کہاں سے لاتا، مجھے تم کل سے شمر اور یزید بنا رہی ہو، لو ابھی دونوں لاشیں نکالے لاتا ہوں، خود اپنی مرضی سے جا ہے جس طرح دفن کر لینا“ میں اٹھ کھڑا ہوا ”ابھی پندرہ منٹ میں تمہاری امانت لا کر تمہارے سپرد کرتا ہوں“ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا اور اٹھ کر آہستہ آہستہ چل دیا۔

شور نے اپنی بیوی سے لجاجت کے انداز میں کہا ”نہیں روکو جو شخص سائیکل پر

لے جا سکتا ہے وہ نکال کے لا بھی تو سکتا ہے، ان کے لئے کون سی بڑی بات ہے اور پھر یہ تو آدمی ایسے ہی ہیں اور مٹی خراب کر دیں گے" شور کی بیگم مجھے آواز دی اور کہنے لگی "اب کہاں جا رہے ہو بھائی؟ سنو تو سہی"

میں: میں ابھی تمہاری امانت تمہارے پاس لائے دیتا ہوں انہیں تام جھام میں رکھ کر دفنا لینا۔

شور کی اہلیہ: میں ہاتھ جوڑتی ہوں اب تو انہیں تکلیف نہ دو۔

میں: اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے انہیں تکلیف دی ہے آج کل نیکی کا بدلہ یہی ہے نا؟"

شور کی اہلیہ: بھائی تمہیں معلوم نہیں مردوں کو تکلیف ہوتی ہے شریعت میں اسی طرح آیا ہے۔

میں: ہوتی ہوگی جی، مجھے تو یہ بتاؤ کہ انہیں وہاں رہنے دیں یا نکال کے لے آوں؟

شور کی اہلیہ: بھائی میں تو ان کا آرام چاہتی ہوں۔

میں: آرام چاہتی ہو تو قرآن شریف اٹھاؤ اور ان کو ثواب پہنچاؤ، اس طرح رونے اور مجھے برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ؟

اس گفتگو کے اختتام پر اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ اپنی اصلی حالت پر آ چکی تھی، تھوڑی دیر ہسپتال میں ٹھہرے پھر میں اور شور باہر آ گئے، شور اب بہت خوش تھا کیوں کہ اسکی اہلیہ کو سکون ہو گیا تھا اور میری الجھن بھی دور ہو گئی تھی۔

شور غالباً تیسرے چوتھے دن اسے گھر لے آیا اور زندگی معمول کے مطابق

گزرنے لگی۔

جہان دانش/۵۵۲تا۵۵۸۔ احسان دانش

افضل امام کی ایک غزل

کلیم عاجز کی کتاب ''ایک دیس ایک بدیسی'' پڑھتے ہوئے، جب افضل امام کی اس غزل پر پہنچا تو بے اختیار محسوس ہوا یہ تو میری صدا معلوم ہوتی ہے، کہ کسی نے دبے ہوئے جذبے کو آواز دے دی ہو، آپ بھی پڑھئے اسی آواز کو۔

ساز بجتے رہے رقص ہوتے رہے، جام و مینا مسلسل کھنکتے رہے
ہم درِ میکدہ پر اکیلے کھڑے دل ہی دل میں سلگتے بھڑکتے رہے
کاسۂ دل میں اک عمر کا غم لئے چاک دامن لئے چشم پرنم لئے
ایک جرم محبت کی پاداش میں درد کے راستوں پر بھٹکتے رہے
ہم نے کتنوں کے چاک گریباں سئے کتنے زخموں کو مرہم کے پھاہے دیئے
اپنا چاک گریباں رہا بے رفو، زخم اپنے ہمیشہ سلگتے رہے
کوئی موسم ہو، گرمی ہو، برسات ہو، صبح ہو، شام ہو، دن ہو، یا رات ہو
اشک آنکھوں میں ہر دم امنڈتے رہے دل میں شعلے ہمیشہ لپکتے رہے
ہم تو اک عمر سے دشت غربت میں ہیں اے امام ہم کو اس کا پتہ ہی نہیں
فصل کیا کیا گلستاں میں آتی رہی پھول کیا کیا چمن میں مہکتے رہے

نپولین

زمانے نے کس سے وفا کی ہے، قدرت کا قانون اٹل ہے، جو پیدا ہوا ہے، وہ مریگا اور جو مر گیا پھر زندہ نہ ہوگا، سر بفلک عمارتیں منہدم ہو کر رہیں گی، سورج ہر روز نہایت شان سے مشرق سے طلوع ہو کر نہایت بے بسی سے مغرب میں غروب ہوگا، انقلاب کا نام دنیا ہے، دنیا میں جان کاہ واقعات آئے دن ہوتے ہیں؛ مگر زمانہ کبھی ان واقعات پر آنسو بہا کر ان کی یاد تازہ نہیں کرتا، کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؛ مگر اکثر اوقات ان واقعات کا دہرانا گناہ اور جرم قرار دیا جاتا ہے، گو تاریخ نگار کے لئے یہ تسکین ضرور ہے کہ وہ واقعات کو تاریخ سے اس لئے اخذ کرتا ہے کہ اس کے ناظرین ان واقعات سے درس عبرت حاصل کریں اور بڑے آدمیوں کی زندگیوں سے نصیحت اندوز ہوں، ان کے مظالم سے اندازہ کریں، کہ دنیا فانی ہے، غرور کا سر نیچا ہے اور وقت کا ابدی مسافر بڑی سرعت سے سبک رفتار گھوڑے پر سوار منزل طے کر رہا ہے، جن با جبروت مشاہیر کی گرج دنیا کو ہلا دیتی تھی، وہ کس طرح تاریک زنداں میں تڑپ تڑپ کر مرغ بسمل کی طرح چل بسے، اچھے آدمیوں کی زندگیاں اندھیری رات میں ستاروں کا کام دیتی ہیں اور ظلم نا انصافی، جبر و استبداد وہ کلنک کے ٹیکے ہیں جو صدیاں گزرنے پر بھی صفحہ تاریخ سے نہیں مٹتے۔

نپولین اعظم کی عظیم الشان مثال ہمارے سامنے ہے، ایک وقت تھا کہ جزیرۂ کارسیکا کا یہ غریب لڑکا اس تگ و دو میں تھا کہ اپنے جسم اور روح کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے غذا حاصل کرے، پیرس کے شوقین لوگوں نے بسا اوقات اس کی اضطرابی حالت کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور اسکی بے بسی کو مسکراہٹ سے ٹال دیا، وہ اس کے سادہ کپڑوں پر ہنسے اور خاموش ہو گئے، انہوں نے اس کے اطالوی لب و لہجہ کا تمسخر اڑایا اور چپ ہو گئے،

زمانہ گذر گیا اور اسی گدڑی کے لعل کو یورپ نے سر آنکھوں پر بٹھایا، فرانس کے لوگوں نے زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا،، دنیا کے بادشاہ اس کے خوف سے لرزہ براندام ہوئے اور ان کی سلطنتیں اس کا نام سن کر کانپ اٹھیں، مغرور بادشاہوں نے اس کے غصہ کو فرو کرنے کے لئے اس کو "برادر معظم" کے لقب سے خطاب کیا، سفیروں نے اس کے روبرو اپنی جبین نیاز خاک پر رکھی، وہ جس کو چاہتا، بادشاہ بناتا اور جس کو چاہتا ایک اشارہ سے گمنامی اور مذلت کی گہرائی میں گرادیتا، اس کا محل دنیا کا بہترین محل سمجھا جاتا، اس کے مرصع فوارے چاندی اگلتے، اسکی کنیزیں جواہرات زیب بدن کرتیں، ایران کے قالین، زربفت کی چلمنیں اور بدخشاں کے لعل اس کے محل کی آب وتاب میں اضافہ کرتے، اٹلی، روس، انگلستان اور جرمنی کے سفیر اس کی ڈیوڑھی پر ادنی ملازموں کی طرح حاضر رہتے اور اسکے ایک تبسم کو اپنی زندگی کی معراج مسرت سمجھتے۔

زمانے نے حسب معمول اس سے بھی بے وفائی کی، وہی شہنشاہ اعظم سینٹ ہلینا میں نہایت بیکسی سے تڑپ تڑپ کر اس دنیا سے چل بسا۔

مشاہیر عالم ۵۰/ کے۔اے۔حمید اے بیرسٹرلا

زیرِ دام

مشہور دیلمی بادشاہ عضد الدولہ بہت ہی سیاس تھا، تمام جنگی تدبیروں کے سوا بعض چالیں جو اس کی طرف منسوب ہیں وہ عجیب ہیں، قسطنطنیہ کے رومی بادشاہ جو عیسائی تھا اس بے چارہ پر عضد الدولہ نے اس طور پر اثر قائم کیا کہ

"قسطنطنیہ کے قریب کسی کھنڈر میں لوہے کا ایک صندوق عضد الدولہ نے گڑوا دیا، جس میں قدیم یونانی حروف میں کچھ پیشین گوئیاں لکھوا کر رکھ دی گئی تھیں، یہی صندوق

شاہ قسطنطنیہ تک پہنچا، کاغذات پڑھوائے گئے، تو اس میں یہ لکھا ہوا بھی ملا ”فلاں زمانے میں عضد الدولہ نامی بادشاہ دیلم سے سر نکالے گا، دنیا کے سلاطین اس کے سامنے جھک جائیں گے اور اطاعت سے جو انکار کرے گا تباہ ہو جائے گا“ شاہ قسطنطنیہ اس مغالطے کا شکار ہو گیا، عضد الدولہ کے پاس سفارت بھیجنے کی تیاری کی، سفراء روم سے جب آئے تو ایک تالاب کے کنارے خیمہ میں عضد الدولہ رات کو ان سے ملا، مینڈک شور کر رہے تھے عضد الدولہ نے اپنے آدمی سے کہا مینڈکوں سے جا کر کہہ دو آج بادشاہ سلامت آئے ہوئے ہیں، شور نہ کریں، مینڈک واقعی اس پیام کو سن کر چپ ہو گئے،

لکھا ہے کہ مینڈکوں کو چپ کرنے کے لئے پانی میں ایک خاص قسم کی چیز ڈالی گئی تھی؛ لیکن رومی سفیروں نے خیال کیا کہ یہ تو سلیمان وقت ہیں۔

مقالات احسانی/۱۳۸۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی

پان اور شوکت تھانوی

میں پان کے سلسلہ میں اہتمام کا نہایت شدت سے قائل ہوں اور کسی ایسے شخص کو پان کھانے کا مستحق نہیں سمجھتا جو ذوق میں ذرا بھی بد ذوقی سے کام لے اور نفاست سے در گزرے، اس قسم کے لوگ نہایت شوق سے چاٹ کھا سکتے ہیں، کچالو کھا سکتے ہیں، مدراسی طریقہ سے دال بھات کھا سکتے ہیں، ان کے کھانے کے لئے بے شمار ملغوبے موجود ہیں؛ اگر صرف پان کو بخش دیں تو یہ ایک عظیم احسان ہوگا، پان کھانے کا حق تو صرف ان کو پہنچتا ہے، جو پان کھانے میں وہی نفاست برت سکیں جو عبادت کے لئے مخصوص ہے، میں آپ سے عرض کروں کہ میں بازار کے کسی پنواڑی سے پان خرید کر کھانا اور سڑک کے نل سے چلو میں پانی پینا ایک ہی بات سمجھتا ہوں اور اگر شدت تشنگی کے باوجود یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ

سڑک کا ٹل کھول کر اس سے چلو لگا دوں اور پیاس بجھا لوں، تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ انتہائی طلب کے باوجود کسی پنواڑی سے پان خرید کر کھاؤں، پنواڑی کی دکان میرے نزدیک پان کی عصمت فروشی کا اڈا ہوتی ہے اور میں انتہائی کوشش کے باوجود ان شاہدان بازاری کی طرف اپنے دل کو مائل نہیں کر سکتا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پنواڑی کی دکان میں یوں تو سب کچھ ہوتا پان بھی اور چھالیہ بھی، کتھا بھی اور چونا بھی، الائچی بھی اور تمبا کو بھی، بس وہی ایک چیز نہیں ہوتی، جس کا نام ہے نفاست، وہ اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کتھے کی کلیا کی چمچی چونے کی کلہیا میں اور چونے کی کلہیا کی چمچی کتھے کی کلہیا میں ڈال کر، پان پر جس بے رحمی اور بے دردی سے لیپا پوتی شروع کرتا ہے، اس وقت وہ تنبولی سے زیادہ قصائی نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ پان نہیں بنا رہا ہوتا ہے؛ بلکہ پان بگاڑ رہا ہے، اور وہ پان پکار پکار کر کہتا ہے کہ

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ممکن ہے آپ اس کو میری شدت پسندی کہیں گے؛ مگر میرے بھائی پان تو اس سے بھی زیادہ شدت پسندی چاہتا ہے، جس کے مزاج میں احتیاط اور نفاست نہ ہو وہ یہ شوق ہی کیوں کرے

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی کوئی زبردستی ہے، کہ پان کھاؤ تو اس طرح کھاؤ جس طرح کہ قسم کھائی جاتی ہے، ورنہ پان کھانا ہی چھوڑ دو، گویا پان کے ساتھ گستاخی کرنے کے لیے بھی کوئی لائسنس کی ضرورت ہے؛ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ میں پان کھانے کے آداب میں نفاست کو اپنے عقیدے کا درجہ دیتا ہوں اور اس عقیدے کی توہین کو مذہبی قسم

کی دل آزاری سمجھتا ہوں، بہر حال یہ زبردستی نہیں؛ بلکہ ایک التجا ہے، آپ کی عدالت میں اپیل کرر ہا ہوں، آپ اس کو رحم کی درخواست سمجھیں اور پان کی جان ناتواں پر رحم فرمائیں، ورنہ یاد رکھیے کہ آپ کا پان کھانا مذاق سلیم رکھنے والوں پر پان کو حرام کر دے گا، پان کے سلسلہ میں ایسی بوالہوسی اختیار نہ کیجئے کہ آبروئے شیوۂ اہل نظر بھاگتی نظر آئے۔

بارخاطر/۱۲۹۔ شوکت تھانوی

رئیس احمد جعفری مرحوم

(۱)

مولانا جعفر شاہ پھلواری مرحوم رئیس احمد جعفری کے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ

ایک مرتبہ رئیس احمد جعفری میرے پاس آئے اور چند قرآنی آیات اور عربی اشعار ترجمے کے لئے لائے، تو میں نے ان سے ازراہ طنز خفی کہا کہ آپ موٹی موٹی عربی کتابوں کا ترجمہ ٹھاٹھ سے کر لیتے ہیں اور ذرا سی عبارت کا ترجمہ مجھ سے کرانے لائے ہیں، کہنے لگے میں قرآنی آیات کا ترجمہ خود نہیں کرتا؛ اگر کوئی مترجم قرآن سامنے نہیں ہوتا ہے تو کسی قابل اعتماد عالم سے کرالیتا ہوں، رہے اشعار تو اس کا ترجمہ خود کرتا ہوں؛ مگر کہیں ہلکا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو اس کا ترجمہ بھی خود نہیں کرتا، ان کی یہ صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی، اس کے بعد جب بھی انہوں نے ایسی خدمت سپرد کی اپنا سب کام چھوڑ کر میں اسے بجالایا۔

(۲)

مشہور شاعر ریاض خیر آبادی رئیس احمد جعفری مرحوم کے نانا تھے، اسی مناسب سے مرحوم رئیس احمد جعفری نے ماہنامہ ریاض نکالا تھا۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں ریاض خیرآبادی مرحوم سے میں نے تازہ غزل کی فرمائش کی کچھ معذرت کے بعد وہ شعر سنانے پر آمادہ ہو گئے، جس کا ایک شعر یہ تھا:

چین مر کر تہِ زمین بھی نہیں
اب ٹھکانہ میرا کہیں بھی نہیں

یوں تو میں اور حاضرین ہر شعر پر داد دیتے رہے؛ لیکن میں مطلع سن کر بے ساختہ بول پڑا کہ آپ تو "میر" سے بھی آگے بڑھ گئے،

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میر کو تو صرف گھبراہٹ ہے، خطرہ و اندیشہ ہے؛ لیکن آپ اس اندیشے کو عبور کر کے بات کر رہے ہیں۔

میں نے یہ واقعہ جعفری صاحب کو سنایا تو انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے میں انہیں کے گھرانے کا ایک فرد ہوں۔

(۳)

ہم دونوں کے قرب کی ایک وجہ اسمی مناسبت بھی ہے، جعفر اور جعفری، چنانچہ عرصہ ہوا ریڈیو پاکستان لاہور میں ایک لطیفہ ہو گیا، وہاں مرحوم چراغ حسن حسرت کی صدارت میں ایک مذاکرہ نشر ہوا، اس میں ہم دونوں کے علاوہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم بھی تھے، اثنائے مذاکرہ دو آدمی ایک ساتھ بولنے لگتے ہیں، یہاں بھی ایسا ہی ہوا، میں اور مرحوم جعفری ایک ساتھ بول پڑے، اس پر فوراً حسرت صاحب نے کہا: ایک ساتھ بولنے کے بجائے باری باری سے گفتگو کیجئے، تاکہ معلوم ہو یہ جعفر ہیں اور یہ جعفری۔

(۴)

وہ کھانے پینے اور دیگر چیزوں میں بڑی احتیاط کرتے تھے، ایک عجیب احتیاط میں بڑی شدت رکھتے تھے، سردی سے بہت گھبراتے تھے، موسم سرما میں ان کے کمرے میں ایک انگیٹھی پلنگ کے نیچے، ایک دائیں ایک بائیں، اوپر سے گرم کپڑوں کے علاوہ لحاف اوراس ماحول میں دیر رات تک کام کرتے رہتے، سردیوں میں ان کا لباس کچھ نہ پوچھیے، ایک ٹھنڈی بنیان ایک گرم، اس کے اوپر ایک ٹھنڈی قمیص اور دوسری گرم، اس کے اوپر ایک یا دو سویٹر، اس پر گرم شیروانی اور اس پر اوور کوٹ، میں دیکھ کر ان سے کہا کرتا تھا کہ: اپنا لحاف کیوں گھر پر چھوڑ آتے ہیں وہ بھی ساتھ اوڑھ کر آیا کیجیے، وہ اور دوسرے رفقاء ادارہ میری اس گفتگو سے لطف لیتے تھے۔

نوٹ: دوسرا شعر کتاب میں ”میر“ کا لکھا ہوا ہے، مگر یہ شعر شیخ ابراہیم ذوق کا ہے۔

رئیس احمد جعفری فن اور شخصیت/۸۲تا۸۵

(۵)

انڈا ٹھیک نہیں تلا گیا، سالن میں نمک کم ہے، مرچیں زیادہ کیوں ہیں، روٹیاں ادھ جلی اور کچی پکی ہیں، پھلکے کہاں ہیں، شوربا گاڑھا کیوں ہے، یہ خوان نعمت چینی کے برتنوں پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو، بے تکلف اٹھا کر پھینک دیتے، برتنوں کے ٹوٹنے اور گرنے کی جھنکار سے گھر بھر کے کان کھڑے ہو گئے، آج پاپا کا مزاج برہم ہے، ہر ایک اپنے اپنے کونے کھدرے میں دبک گیا؛ مگر ممی ہیں خاموش سامنے ڈٹی ہوئی ہیں اور حضرت قرآن لے کر بیٹھ گئے، پڑھے جاتے ہیں، کبھی کبھار اس عالم میں نماز کی نیت بھی باندھ لیتے، باوضو ہوں نہ ہوں اس کی کوئی قید نہ تھی، اماں جی پھر چولہا گرم کرنے میں منہمک ہو گئیں، باورچی

عبدل منہ چڑھا بھی ہے اور پٹھان بھی، مگر رسب پکھ سینی میں سجا کر اصرار کر رہا ہے، اب کھا کے دیکھئے، مزہ نہ آئے تو جو چور کی سزا وہ میری، خوف اور دہشت کے بادل چھٹ گئے، صاحب خانہ نے خاموشی اور ایک متکلم وقار کے ساتھ خوش سیر ہو کر ہاتھ بڑھایا اور ذرا سا ستا کر گھر سے باہر نکل گئے، یہ معمول ہر ہفتہ کا تھا۔

(۶)

کھانا وہ بھی کھا رہے ہیں اور ان کے ایک عزیز، عزیز کرمانی بھی، گفتگو بعض مذہبی مسائل سے نکلتی ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ جاتی ہے، غسل خانے میں ہاتھ دھونے گئے، عزیز بھائی پیچھے پیچھے اپنے دلائل کے طومار پیش کیے جاتے ہیں، اب دونوں آمنے سامنے کھڑے ہیں، تڑاخ کے تھپڑ عزیز بھائی کے منہ پر پڑتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر زبان درازی برداشت کیوں کر کرتے، نو بجے ہی سب بستروں میں چلے گئے۔

(۷)

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مشہور ادیب، حالی کی آنکھیں اور کتب خانہ دیکھے ہوئے، مرنجا مرنج منحنی سے بزرگ تھے، مگر تھے مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو اور نہایت خلوص نیت سے اپنے عقائد پر قائم، جعفری صاحب کے یہاں آ جا بہت بڑھ گئی تھی، غالباً پانی پت کے کتب خانے سے استفادہ بھی ہوتا رہتا تھا، روز کی ملاقاتیں، کھانے پر موجود، چہل قدمی میں ساتھ، بازار کے پھیرے میں شریک، ادبی و شعری نشستوں میں شانہ بشانہ، شامت اعمال، مرزا کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہم سر بتانے لگے، جوش غضب جو دیکھ کر دم دبائے دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ پشت پر جوتا رسید ہوا، کسی کو بیچ میں ڈال کر پھر آنے

جانے لگے۔

(۸)

غلام احمد پرویز صاحب نے اپنے ماہنامہ ''طلوع اسلام'' میں طرح طرح کے شوشے چھوڑنے اور گل کترنے شروع کئے، مرحوم نے ''زمیندار'' میں بھد اڑائی، کہا کرتے تھے، بھئی واقعی بڑا احرام الدہر ہے۔

آدمی غنیمت ہے/۱۳۲۔ سید انیس شاہ جیلانی

شہر لکھنؤ

دفتر کی علاحدگی سے تو ایک گونہ خوشی تھی، لیکن لکھنؤ چھوڑتے ہوئے دل بڑا اداس تھا، اس کی صحبتیں، اس کی مجلسیں، اس کی محبتیں، اس کی عنایتیں میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھیں، جیسے کوئی مہ جبیں اپنے محبوب کو باچشم نم، با زلف پریشاں رخصت کر رہی ہے، لکھنؤ ایک تہذیب ہے، ایک روایت ہے، وضعداروں کی ایک تاریخ ہے، مجلسی آداب رسم ملاقات، کورنش وتسلیمات کی اپنی ایک ادا ہے، ایک دلکش انداز ہے، زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں، لب ولہجہ میں شہد کی مٹھاس، سامنا ہونے پر ہاتھوں کی جنبش، گردن کا خم، تبسم زیرلب کی شگفتگی کی ایک تیز خوشبو تھی جو تھوڑی دیر کیلئے دل ودماغ کو ایسا معطر کر دیتی، خوش اخلاق، پاکیزہ وضعداری، لب ولہجہ کی حلاوت، انسان کو رنگ ونور کی شبنمی فضاؤں میں پہونچا دیتی تھی۔

ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ آتے اور مجھ سے بڑی لجاجت سے کہتے کہ اسیر صاحب! ہم کو لکھنؤ دکھا دیجئے، لکھنؤ سے جتنی حسین کہانیاں وابستہ ہیں، لکھنوی تہذیب کی منظر کشی اور عکاسی کتابوں میں جو موجود ہے، لوگ اس کو پڑھتے ہیں تو ان کے دماغ میں

لکھنؤ ایک شہر کے بجائے اندر سبھا کی دربار بن جاتا ہے، وہ لوگ اسی لکھنؤ کو ڈھونڈھنے کیلئے یہاں آتے تھے اور مجھ سے تنہائی میں خوشامدیں کرتے کہ میں ان کو ضرور دکھادوں۔

داستان ناتمام/۲۳۶۔اسیر ادروی

پیالی اور اسیر ادروی

دستار سر بازارگری

میں حمزہ کے ساتھ اکبری گیٹ گیا ہوا تھا، واپسی میں نخاس روڈ پر چینی کے برتنوں کی ایک مکان پر نظر پڑی تو میں نے حمزہ سے کہا کہ دفتر کی ساری پیالیاں زخم خوردہ ہو چکی ہیں کسی کے سامنے پیش کرنے کے لائق نہیں رہ گئیں، اس دکان سے ایک درجن پیالیاں خرید لی جائیں، ہم دونوں دکانوں میں پہونچ گئے، دکان میں زمینی فرش تھا، ہم دونوں بیٹھ گئے، دکاندار سے چائے کی پیالیاں دکھانے کیلئے کہا، اس نے مختلف ڈیزائنوں کی بہت سی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں، ان میں سے ایک ڈیزائن کو پسند کر کے میں نے کہا کہ اس ڈیزائن کی پیالیاں نکال دیجئے، دوکاندار نے اس ڈیزائن کی بہت سی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں، حمزہ ہر پیالی کو دیکھ کر جو صاف ستھری اور بے داغ تھیں ایک طرف رکھ رہے تھے، اسی دوران محلّہ کی ایک عورت کالے نقاب میں آئی، چہرہ کھلا ہوا تھا، وہ اسی فرش پر بیٹھ گئی، جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے، چہرے کا شبابی رنگ تو رخصت ہو چکا تھا، البتہ سنہرا رنگ گہرا ہو گیا تھا، جو اس کی عمر کی پختگی کی علامت تھی، رنگ گورا، بدن چھریرا، سبک ناک نقشہ، چہرے پر گھریلو عورتوں کی سادگی و سنجیدگی، عفت و شرافت تھی، اس کی عمر تیس بتیس سے کم نہیں رہی ہوگی، وہ ہماری خریداری کو دیکھنے لگی کہ دوکاندار خالی ہو تو اپنی ضرورت کے

سامان خریدے، جب حمزہ ایک درجن پیالیاں الگ کر چکے تو پیالیاں میری طرف بڑھا دیں کہ ایک نظر میں بھی دیکھ لوں، میں پیالیاں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ اس عورت نے ہاتھ بڑھا کر پیالیاں میرے سامنے سے سمیٹ کر اپنے سامنے رکھ لیں اور ہر پیالی میں انگلیاں پھرا کر اندر باہر دیکھ کر رکھتی گئی، اس طرح ساری پیالیوں کو دیکھنے کے بعد اس نے تین چار پیالیاں الگ کر دیں اور کہا کہ ان کو بدل لیجئے، یہ ٹھیک نہیں ہیں، میں نے ان پیالیوں کو دیکھا تو مجھ کو ان میں کوئی عیب نظر نہیں آیا تو خاتون سے پوچھا ان میں کیا خرابی ہے؟ اس نے بتایا کہ پیالیوں کے اندر ایک دو ذرات ابھرے ہوئے ہیں، پیالیوں کے دھونے میں انگلیوں میں خراش بھی آسکتی ہے، شکر ڈال کر چمچہ چلاتے ہوئے ان ذرات سے چمچہ ٹکرائے گا تو ذہن پر ناخوشگوار اثر پڑے گا۔

میں نے دل میں کہا اللہ اللہ! پیالی میں ایک ذرہ ابھرنے پر انگلیوں میں خراش آنے کا تصور، چمچہ چلاتے ہوئے ذرے سے ٹکرانے پر دماغ پر ناخوشگوار اثر کا خیال صرف لکھنؤ کی خواتین ہی سوچ سکتی ہیں، گویا ہم دیہاتی اور گنوار ثابت ہوئے، اب مجھے شرارت سوجھی میں نے حمزہ سے کہا تم بالکل ناتجربہ کار ہو تم کو انگلیوں سے دیکھ لینا چاہئے تھا۔ میرے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک تھی، کیونکہ میں انگلیوں کے لفظ پر خاص زور دیا تھا، عورت مرد کا چہرہ اور آنکھیں پڑھنے میں اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا پوسٹ مارٹم کرنے میں بھی کمال رکھتی ہے، وہ بھی لکھنوی تہذیب کی پردہ دار خاتون تو اس کی اسپیشلسٹ ہوتی ہے، وہ فوراً سمجھ گئی کہ بات کا انداز لطیف مذاق اور مہذب چھیڑ کا ہے، اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا ان کو ڈانٹنے سے کیا فائدہ؟ آپ تو تجربہ کار ہیں، میری دونوں کن پٹیوں کے بالوں میں سفیدی آچلی تھی، میں نے اس کے نیلے گلابی ہونٹوں پر

ایک ہلکے سے خم کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ اپنی مسکراہٹ پر سنجیدگی کی نقاب ڈال رہی ہے، مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، مجھے اپنی چرب زبانی پر ناز تھا؛ مگر لکھنؤ کی ایک گھریلو خاتون کے صرف ایک جملے نے میرے غرور کا سر نیچا کر دیا اور میرا سارا نشہ ہرن کر دیا، دل نے کہا اسیر صاحب اپنی دستار سنبھالیے، یہ لکھنؤ ہے۔

اسے میخانہ کہتے ہیں، یہاں پگڑی اچھلتی ہے

مجھے اتنی خفت اور شرمندگی ہوئی کہ پھر اس خاتون سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں ہوئی، دکاندار سے پیالوں کو پیک کروایا اور فوراً وہاں سے چل دیے، اس سے دفتر تک پورے راستہ میں ملک زادہ کا مصرعہ یاد آتا رہا۔

ہم سر تو بچا لائے لیکن
دستار سر بازار گری

داستان ناتمام/۲۳۸۔اسیر ادروی

کتوں کی قبریں

ایک دن میں اور برادرم خورشید ملک ایک پر فضا مقام سے گزر رہے تھے کہ خورشید صاحب نے کہا:

کلیم بھائی! دائیں طرف دیکھئے، میں نے دیکھا اور غور سے دیکھا، انہوں نے پھر پوچھا: دیکھا؟ کیا دیکھ رہے ہیں؟

میں نے کہا، دیکھا اور دیکھا کیا ہوں، ہندوستان میں چھوٹے بڑے شہروں میں دیکھا ہے، فرق یہ ہے کی یہ امریکہ ہے، یہاں مال کی فراوانی ہے، اس فراوانی کا اظہار یہاں ہیں، یہ عیسائیوں کا قبرستان ہے، رقبہ بڑا حسین ہے، فنیشنگ بہت حسین ہے، اندر

قبروں پر امارت کا اظہار ہے، شاندار کتبے ہیں، شاندار تعویذیں ہیں، باغ میں پھلواریاں ہیں، حسین روشیں ہیں، مال والوں کی قبریں ہیں، مال کی نمائش ہے۔

خورشید بھائی نے کہا تب آپ نے نہیں دیکھا اور نہیں سمجھا، جناب یہ عیسائیوں کی قبریں نہیں ہیں، یہ عیسائیوں کے کتوں کی قبریں ہیں اور میرے دل کو ایک دھکا سا لگا آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں اور گردن ایک جھٹکے سے مڑ گئی۔۔۔۔۔اور دیکھا کہ نئی تہذیب کے دیوتا کی قبریں بالکل انسانی قبروں کی طرح قطار سے دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، جن کے اردگرد رنگ برنگ کے خوشنما پھول کھل رہے ہیں، جھاڑیاں جھوم رہی ہیں، مرمریں تعویذیں اور کتبے چمک رہے ہیں اور چند قبروں پر مرد، عورتیں، بچے اور لڑکیاں ہاتھ باندھے سر جھکائے ایسی عقیدت اور محبت سے کھڑی ہیں جیسے بزرگوں کے مزاروں پر مسلمان مراقبے میں کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک دیس ایک بدیسی ۱۲۴/کلیم عاجز

ملک الموت

ابتدائے آفرینش سے پرستش کا جذبہ انسانوں میں ہے، انسان ہمیشہ اس کے سامنے جھکا، جس کو بڑا سمجھا اور جس سے پیار کیا، خدا سب سے بڑا اور سب سے حسین اور سب سے زیادہ پیار کے قابل ہے، انسان اس کے آگے جھکتا ہے، اس سے پیار کرتا ہے، اس کے پیار کی داستان تاریخوں میں بکھری ہوئی ہیں، اس کی عظمت سے آج بھی انسانوں کے دل جھک جاتے ہیں، وہ خدا پرست کہے جاتے ہیں، بڑائی اور افادیت سورج اور چاند میں دیکھی، ان کے آگے بھی لوگ جھکتے رہے اور جھکتے ہیں، درختوں سے پھل پایا، سایہ پایا، اس کے آگے جھکے، پانی سے سیرابی ملی اور غرقابی بھی ملی محبت اور وحشت نے پانی کے آگے

جھکایا، آگ میں طاقت دیکھی، افادیت دیکھی، روشنی دیکھی، حرارت دیکھی، زندگی کی علامت دیکھی، اس کے آگے جھکے، بڑے انسانوں نے انسانوں کو بڑا اور اچھا بنانے کی محنتیں کیں، انسانوں نے ان کا بت بنایا، ان کے آگے جھکے، تاریخ میں خدا پرستوں، آتش پرستوں، بت پرستوں نے ہر پرستش میں پرستش کا جواز نکالا اور جھک گئے، اس عقل اور علم کی معراج پہنچی ہوئی دنیا میں سب سے زیادہ دانش منداور عاقل ترین قوم نے کتے میں پرستش کا کیا جواز نکالا ہے اور کیوں سگ پرست ہوئے؟ یہ تاریخ آئندہ بتائے گی۔ ہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

سر سید احمد خان مرحوم ومغفور ایک بارکہیں جارہے تھے،فرسٹ کلاس ڈبے میں ایک برتھ پر تشریف رکھتے تھے اور زنجیر میں بندھا ہوا ان کا کتا بھی نیچے بیٹھا تھا، اتفاق سے تھوڑی دیر بعد حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم بھی اسی ڈبے میں تشریف لے آئے، صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد، مولانا الگ دوسرے برتھ پر بیٹھ گئے ذرا وقفے کے بعد سر سید احمد مرحوم مسکراتے ہوئے مزاح فرمایا، کہا: ''مولانا آپ کتے کو ناپاک کہتے ہیں اور الگ رہتے ہیں میں نے کتے کو اس لیے اپنا ساتھی بنالیا ہے کہ کتے کے قریب فرشتے نہیں آتے ،لہٰذا میرے پاس ملک الموت نہیں آئیں گے''۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے برجستہ کہاں''سید صاحب کتے کی روح قبض کرنے کو بھی تو کوئی فرشتہ آئے گا، آپ کی خدمت بھی انجام دے دیگا''۔

اور دونوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

ایک دیس ایک بدیسی/۱۲۵/کلیم عاجز

سردار جی

والی آسی ایک دفعہ پنجاب کے کسی شہر میں مشاعرے میں غزل پڑھ رہے تھے، غزل میں ایک شعر تھا۔

شاید آ جائے کوئی ہم سے بھی زیادہ پیاسا
بس یہی سوچ کر تھوڑی سی بچا رکھی ہے

داد تحسین ختم ہوئی تو ایک سردار جی اٹھے، انہوں نے بیگ سے بوتل نکال کر سامنے رکھ دی کہ پیاسا آ جائے تو اس میں سے پلا دینا اور جو بچا رکھی ہے اسے پی لو۔

بجھے دیوں کی قطار ۱۳۷ - حفیظ نعمانی

طوائف کی عزت

غالباً ۱۹۹۰ء میں سرونج کی ایک طوائف ''گوہر'' جو تقریباً میری ہی ہم عمر یا مجھ سے کچھ چھوٹی ہوگی، حج کے لیے آئی، ایک متوسط درجہ کے قصبہ کی رنڈی کو کون نہیں جانتا، بیوی بھی اس کے نام سے واقف تھیں، جس گروپ میں وہ آئی تھیں، اس میں میری بیوی کا حقیقی بھانجا فرید احمد اور اس کے کچھ سسرالی رشتہ دار بھی تھے اور مکہ مکرمہ میں سب کا قیام ایک ہی مکان میں تھا۔

فرید اور اس کے رشتہ داروں کو تو مجھے گھر پر مدعو کرنا ہی تھا؛ لیکن میں اس پس وپیش میں مبتلا رہا کہ گوہر کو مدعو کروں یا نہیں، اپنی اس الجھن کا ذکر میں نے اپنی بیوی سے کیا کہ گوہر کو اپنے گھر بلانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے، بیوی نے جواب دیا کہ آپ کا گھر اللہ کے

گھر سے بھی زیادہ مقدس ہو گیا کہ اللہ نے تو اسے اپنے گھر بلا لیا؛ لیکن آپ کو اسے اپنے گھر بلانے میں شرم آ رہی ہے، بیوی کے اس جواب پر مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ اتنی کٹر مذہبی عورت کے قلب میں یہ وسعت کہ انہیں ۔۔۔۔۔۔ کے بعد حج پر آنے والی بلی کو اپنے گھر پر مدعو کرنے میں کوئی باک نہیں؛ لیکن میری تنگ ظرفی کہ اس کے باوجود میں اسے گھر پر بلانے کی جرأت نہ کر سکا۔

حیات بقا اور کچھ یادیں/۶۶۔ محمد مظہر بقا

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد رمضان میں گھر جانے کے بجائے چند دوستوں کے ساتھ لاہور کا رخ کیا کہ مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچ کر ان سے تفسیر کا درس لیا جائے، جس کی طلبہ کے درمیان بڑی شہرت تھی، اللہ تعالی نے مولانا مرحوم کو ربط آیات میں بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، چونکہ ہم لوگ فارغ التحصیل تھے اس لئے اشاراتی انداز میں تقریباً ڈیڑھ ماہ میں قرآن کریم ختم کرایا، لاہور کی تفریح بھی خوب کی، ایک فقیر (داتا گنج بخش) کا بھرا دربار بھی دیکھا اور ایک بادشاہ جہانگیر کا اجڑا دیار بھی، ایاز کی قبر بھی دیکھی جس پر پھول چڑھے تھے اور زیب النساء کا مقبرہ بھی جو واقعتا اسی کے اس شعر کی مصداق تھا۔

برمزار ما غریباں نے چراغ و نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ ہے، نہ کوئی پھول، نہ کسی پروانے کا پر جلتا ہے، نہ بلبل کی صدا آتی ہے۔

حیات بقا کچھ یادیں/۹۵۔محمد مظہر بقا

سیاستداں، فلسفی، شاعر ''دانتے''

زمانے نے عجیب وغریب رنگ دیکھے؛ مگران سب پر فراموشی کی چادر ڈال دی، اسکندر اعظم، صلاح الدین ایوبی، نپولین، چنگیز خان اور امیر تیمور ایسی کئی ہستیاں دنیا کے بحر ناپید کنارے سے ابھریں اور ہمیشہ کے لئے غرقاب ہوگئیں، وقت کے ابدی مسافر نے ان کی یاد اور یادگاروں پر چار آنسو بہائے اور خاموشی سے گزر گیا، ان کی بنائی ہوئی فلک بوس عمارتیں منہدم ہوکر مٹی میں مل گئیں، سینکڑوں تاجدار ایسے بھی ہوئے، کہ زمانہ ان کے نام سے آشنا بھی نہیں ہے؛ لیکن اقلیم سخن کے شہنشاہوں کا کلام ابدالآباد تک زندہ رہے گا، قومیں انہیں پڑھ کر سر دھنیں گی، ملکوں کو ان کی ہستیوں پر ناز ہوگا، ان کا کلام روحوں میں کیف اور دماغوں میں مستی پیدا کرے گا، شہنشاہ اسے سرہانے رکھ کر سونا باعث فخر سمجھیں گے، اس کے اثرات سے دلوں میں تڑپ پیدا ہوگی، خیالات کی رفعت، افکار کی نزاکت اور محاوروں کی بندش سے تلاطم خیز موجیں اٹھیں گی اور بحر بیکراں بن کر دنیا کی کثافت کو نیست ونابود کردیں گی، ان شاعروں کی صف اول میں دانتے کا نام آفتاب نصف النہار کی طرح دنیا کے قیام تک درخشاں رہے گا۔

مشاہیر عالم/ا۔ کے۔ اے۔ حمیدبی، اے بیرسٹرایٹ لا

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

۴۸۷ ہجری میں مستظہر باللہ عباسی کو خلافت کا عہدہ پیش ہوا تو امام غزالیؒ اس کے ارکین سلطنت میں تھے، دینی اور علمی شعبہ پر ان کو مکمل اختیار حاصل تھا، حضرت امام غزالیؒ

بڑے جاہ وجلال اور عزت وشہرت کی زندگی بسر کرتے تھے؛ مگر جب انھوں نے جنید وشبلی، بایزید بسطامی اور ابو طالب مکیؒ کے ملفوظات کو دیکھا کہ جب تک عمل نہ ہو، خالی علم سے کچھ حاصل نہیں اور عمل کے لیے زہد وریاضت کی ضرورت ہے، یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک عشق رسول نہ ہو تو انہوں نے حقیقت پر غور کیا۔

ان کے بھائی امام احمد غزالیؒ بڑے عالم اور صوفی تھے، اسی دوران ایک روز وہ ان کی طرف آئے، ان کے جاہ وجلال کو دیکھ کر چند اشعار پڑھے، جن کا مفہوم یہ تھا:

''تم دوسروں کو ہدایت کرتے ہو؛ لیکن خود ہدایت نہیں پکڑتے، وعظ سناتے ہو؛ لیکن خود عمل نہیں کرتے، اے سان کے پتھر! تو لوہے کو تیز تو کرتا رہے گا؛ لیکن کاٹے گا نہیں''۔

اتنا سننا تھا کہ ۴۸۸ ہجری میں انہوں نے یک لخت اس عہدے کو چھوڑ دیا اور تمام عظمت وجلال سے دست بردار ہو گئے، تمام علماء اور ارکین سلطنت نے ان کی انتہائی خوشامد کی، کہ یہ ملت کی بدنصیبی ہے، ایسے نفع اور عزت کے عہدے سے دستبردار ہونا اچھا نہیں ہے؛ لیکن امام غزالیؒ کو عشق رسول نے ایسا دیوانہ بنا دیا کہ سب چھوڑ چھاڑ کر بغداد سے نکل کر شام کا راستہ اختیار کیا، ذوق ووارفتگی کا یہ عالم تھا کہ قیمتی اور پر تکلف لباس کی جگہ صرف ایک کمبل نے لے لی تھی، لذیذ غذائیں چھوڑ کر گھاس اور پات کھانا شروع کر دیا تھا۔

سامان کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی

مقصد ہے اگر منزل غارت گر ساماں ہو

اقبال

پراسرار بندے/۲۹۶_عشرت جاوید

اقبال اور خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی صاحب ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے تھے اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہو جاتے تھے، قائداعظم سے اختلاف ہوا تو عرصہ دراز تک ان کے خلاف لکھتے رہے، پھر ان کے ہم خیال ہوئے تو اس شدت کے ساتھ کہ قرآن کی رو سے مولانا آزادؒ کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا، اس کے بعد پھر مولانا آزادؒ کے بھی دوست ہو گئے، علامہ اقبال سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات بہت خوشگوار تھے، نہ جانے کس بات سے خواجہ صاحب کو رنجش ہوگئی کہ اقبال کو شاعر مشرق سے گھٹا کر، شاعر پنجاب لکھنا شروع کر دیا، علامہ اقبال نے سوچا یہ تو بہت برا ہوا، انہوں نے خواجہ صاحب کو زک دینے کی ایک تدبیر سوچی، خواجہ صاحب کو ایک خط لکھا کہ میرے گھٹنے میں مدت سے درد تھا، میں نے آپ کا فاسفورس کا تیل ملا، اس سے درد کو افاقہ ہوگیا، اس دن سے علامہ اقبال پھر شاعر مشرق ہو گئے، منادی میں فاسفورس کا جو اشتہار چھپتا تھا، اس میں شاعر مشرق سر محمد اقبال کی رائے ضرور شائع ہوتی تھی۔

نوٹ: خواجہ صاحب حکیمی دوائیاں بہت بناتے تھے۔

شاہد احمد دہلوی کے شاہکار خاکے ص ۶۱

گہوارۂ ادب لکھنؤ

خدا کے لئے بتایئے لکھنؤ کے وہ تانگے والے کیا ہوئے، جن کی فقرہ بازیاں مشہور تھیں، کہ کوئی موٹی سواری دیکھ لی تو فقرہ چست کر دیا، کہ حضور دو کھیپ میں آپ کو پہنچا سکوں گا، یہ تو ہوا کرایہ اور زائد دام کمائی دم کرانے کے لئے مانگ رہا ہوں اور جب دام کسی طرح طے نہ ہوئے تو کہا کہ بہتر ہے حضور گھوڑے سے آنکھ بچا کر بیٹھ جایئے، یہ وہی لکھنؤ تو

ہے۔ جس کے ایک تانگے والے نے حضرت حفیظ جالندھری کے اس تقاضہ سے کہ ذرا تیز چلو، عاجز آ کر گھوڑے کو روک لیا تھا اور حفیظ صاحب سے دست بستہ عرض کیا تھا، کہ حضور کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ خود مجھے ارمان نہ ہوگا، کہ میرا گھوڑا تیز چلے، ذرا اپنی چال دکھائے؛ مگر کیا عرض کیا جائے، ایسا آرام طلب گھوڑا ہے کہ کبھی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیتا، اللہ جانے کسی رئیس کا چشم و چراغ ہے یا ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے، یہی وجہ ہے حضور کہ اس کے ساتھ گستاخی کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی، آخر کیا ہوئے وہ تانگے والے۔

خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

بار خاطر/۲۸۲۔ شوکت تھانوی

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

اللہ تعالیٰ نے ابوالکلام کو ذہانت، بصیرت، جودت اور فہم قرآن کا بہت خاص ذوق بخشا تھا، البلاغ اور الہلال کی ۴، ۵ سال کی جلدیں اور ان کی تفسیر ترجمان القرآن اس کی شاہد و عدل ہیں، اس اعتبار سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے زیادہ ان کا قدردان اور عظمت شناس دوسرا کون ہوسکتا ہے، ایک ہی ادیب دوراں کے دونوں خواجہ تاش ہیں، ایک ہی خرمن کمال کے دونوں خوشہ چیں ہیں، مولانا شبلی کی بارگاہ میں دونوں کا گذر تھا، ایک فیض صحبت سے ادیب و فلسفی ہوگیا اور دوسرا انشاء پرداز اور تدبیر و سیاست کا امام، ایک مشرق علوم و فنون کے احیاء کا علم بلند کیا اور دوسرے نے مغربی فلسفہ اور مغربی فلاسفہ و حکماء سے اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا، ایک کی اس دور کے یادگار الہلال کی جلدیں ہیں اور دوسرے کی فلسفۂ جذبات اور تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ، پھر شدت ہم ذوقی نے دونوں کو یکے بعد دیگرے قرآن کا خادم بنا دیا؛ اگر ایک کی تفسیر قرآن قابل ذکر شاہکار ہے تو دوسرے کا

انگریزی ترجمۂ قرآن اور اس کے حواشی اور فٹ نوٹ بھی اپنی جگہ خوب ہیں، ایک پھیلا اور پھیل کر سارے ہندوستان پر چھا گیا اور دوسرا سمٹا اور سمٹ کر دریاباوی میں معتکف ہو گیا، دونوں کا مقصد زندگی تقریباً ایک تھا؛ اگر چہ راہیں مختلف تھیں، ایک نیشنلزم کی راہ سے مسلمانوں کی خدمت کر رہا تھا، بلاشبہ مسلمانوں کے سواد اعظم نے ساتھ نہیں دیا اور یکہ وتنہا، اسی راہ پر چلتا ہے، دوسرا ہر قسم کے ہنگاموں سے یکسو ہو کر خالص علمی طریقہ سے مسلمانوں کے دل و دماغ کی اصلاح کر رہا ہے، ایک یورپ اور خصوصاً انگریزوں پر کید وفریب سیاست سے خبردار کر رہا ہے اور دوسرا یورپ کی تمدنی، تہذیبی ومعاشرتی غلبہ وسطوت سے مسلمانوں کو بچا رہا ہے، دونوں ہی کی بحمد اللہ ذہنی وفکری قوتیں بے پناہ ہیں۔

بہت عرصہ کی بات ہے کہ مولانا آزاد اور دریاباوی کے درمیان لذت والم اور حظ وکرب کے مترادفات یا اضداد پر الہلال ہی کے صفحات میں ایک ادبی ولغوی معرکہ ہوا تھا، جو اس قدر دلچسپ تھا کہ ارباب ادب آج تک اس کے مزے لے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے دونوں الگ الگ طرز انشاء اور اسلوب تحریر کے مالک ہیں، جن میں سے ایک کا طرز عسیر التتبع ہے اور دوسرا علم وادب کے تمام ذوق رکھنے والوں کے لئے لائق تقلید واتباع، ایک میں غیر معمولی شکوہ، بلندی اور خطابت ہے اور دوسرے میں کمال درجہ کی عذوبت، سلاست اور روانی، ایک کا اول مشغلہ زندگی ہی میں تقریباً منقطع ہو گیا تھا اور دوسرے کا اب تک جاری وساری ہے اور ایک عالم کو اپنے افادات وافاضات سے مستفیض کر رہا ہے، دونوں ہی کے ادب پر مولانا شبلی کے ادب کا پرتو ہے اور ہر اعتبار سے دونوں ان سے سب سے زیادہ متاثر۔

فاران/۱۹۶۲

اعتذار

حضرت مولانا (ابوالکلام آزادؒ) کی عظمت اور بڑائی کو اگر میں ان چند اوراق میں پوری طرح ظاہر نہ کرسکا تو اس کے متعلق میرا اعتذار ایک مشرقی مفکر کے ان الفاظ میں موجود ہے۔

"میں نے ساحل پر کھڑے ہو کر جہاز کو دیکھا جو اپنے سفید بادبانوں کو کھولے ہوئے، سمندر کی وسعتوں میں جانب بہا جا رہا تھا، وہ جس قدر میری نظروں سے دور ہوتا گیا، اس کی جسامت کم ہوتی گئی اور وہ جب اس خط افق پر پہنچا جہاں سمندر سے آسمان مل جاتے ہیں، تو تماشائیوں نے کہا: لو جہاز تو غائب ہو گیا"

میں نے کہا: جہاز غائب نہیں ہوا ہے اور نہ اس کی جسامت کم ہوئی ہے، وہ تو اب بھی افق پر اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ بندرگاہ میں تھا، اس کے قد و قامت کا اختصار در حقیقت ہمارے دماغوں اور ہماری نظروں میں ہے، سمندر کی سطح پر اس کی بڑائی وہی ہے جو تھی، صرف ہم اسے چھوٹا دیکھتے ہیں، اس لئے کہ دور سے دیکھتے ہیں، یہ قدریں اور قیمتیں خود ہماری نظر کی ہیں، اصلیت میں تو اپنی جگہ کوئی تغیر نہیں"۔

یہ میرا جواب ان لوگوں کے لئے ہے جو یہ سمجھیں کہ میں اپنے موضوع کی حقیقت کو پوری طرح پیش نہ کرسکا۔

ابوالکلام آزاد رے۔ قاضی محمد عبدالغفار

حیرت نہیں گئی

اس کی آمد آمد کی خبر سے لاہور کے در بار گونج رہے تھے، سیکڑوں آدمیوں کا مجمع اس پلیٹ فارم پر منتظر کھڑا تھا، جس پر کلکتہ سے آنے والی گاڑی کو رکنا تھا؛ مگر شاید پانچ آدمی بھی ان کی صورو شکل اور شناختی علامتوں سے واقفیت کا دعویٰ کرنے کے قابل نہ تھے۔

ایک اجنبی کے لئے اس ہجوم کے انتظار و اضطراب کی شدت کا حال یہ تھا کہ اس سمت سے اس کی نگاہ ہی ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی، جدھر سے گاڑی آنے والی تھی۔

خدا خدا کر کے انتظار کے لمحے ختم ہوئے، چھک چھک کرتی گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی، سارا مجمع ریل پر ٹوٹ پڑا، کوئی آدمی بھی ابوالکلام کی صورت سے آشنا نہ تھا؛ لیکن ہر آدمی ابوالکلام کو ڈھونڈ رہا تھا، اس کی زیارت کے لئے بیتاب اور اسے دیکھنے کے شوق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔

اس ہلچل اور ہنگامہ کے دوران متوسط قد کا ایک دبلا پتلا لڑکا ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے سے نکلا اور بے نیازی اور بے پروائی کے انداز میں مجمع کی طرف بڑھنے لگا، انار کے دانوں کی سرخی کی جھلک مارنے والا، گورا چٹا رنگ، شاہزادوں جیسی صورت، نفیس اور بے عیب شیروانی، سر پر غالب کی تصویروں والی اونچی باڑھ کی ٹوپی، بڑی بڑی گہری اور غلافی آنکھیں، ستواں ناک، چہرے پر داڑھی تو کیا داڑھی کے آثار تک ندارد، مسیں بھیگی ہوئی، بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی تخمینہ میں آنے والی عمر، بشرے پر ذکاوت و ذہانت کی چمک، متانت کے رعب اور تحقیق کے انداز کے ساتھ اس نے انجمن کے ذمہ داروں کو دریافت کیا تو سارے مجمع پر مایوسی اور افسردگی کی لہر دوڑ گئی، ہر آدمی یہ سمجھا کہ مولانا ابوالکلام نے خود تشریف لانے کو اپنی شان کے خلاف سمجھ کر اپنے صاحبزادے کو نیابت کے

لئے بھیج دیا ہے؛ لیکن جب اس اجنبی نے اپنا تعارف مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے کرایا تو حیرت، تعجب اور بے یقینی کے عالم میں سارا مجمع ششدر ہو کر رہ گیا؛ لیکن ابھی آزمائش ختم کہاں ہوئی تھی؟ ایک اور حیرت کا پہاڑ ایک ایسے شخص پر ٹوٹنا تھا، جس نے نادر روزگار شخصیتوں کی آنکھیں دیکھی تھیں، یہ شخص مولانا حالی تھے، اردو شاعری کے نئے دور کے پیغمبر، غالب، شیفتہ، صدرالدین آزردہ، ذوق، مومن اور فضل حق خیرآبادی کے ہم نشیں، آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار کے حاضر باش، ابوالکلام کی یادگار اور دھواں دھار تقریر کے بعد انہوں نے مبارک باد دیتے ہوئے فقرہ کسا۔

"میاں خوب بول لیتے ہو!"

مخاطب ابوالکلام جیسا ذہانت کا پتلا تھا، فقرے کی بلاغت چاہے جس عظمت کی ہو، اس میں چھپا ہوا طنز و اعتراض اس سے کہاں بچ کر جا سکتا تھا، مطلب یہ تھا کہ کسی دوسرے کی کی ہوئی تقریر کو بڑی کامیابی کے ساتھ مجمع میں سنا دیا۔

اس وقت وقار کا یہی تقاضہ تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے چنانچہ خاموش رہے؛ لیکن اگلے دن ایک تجویز پر بولنے کی اجازت صدر جلسہ مولانا حالی سے طلب کی اور اجازت حاصل کر کے دو گھنٹہ چالیس منٹ ایسے زبردست خطابت سے لبریز تقریر کی کہ لوگوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اتنا وقت کیسے گزر گیا، علم، ذکاوت، قوت استدلال، الفاظ کے سحر، نکتہ دانی اور فہم و فراست کا ایک بحر ذخار تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا اور لوگ تھے کہ اس میں بے اختیار ڈوبے اچھلے چلے جا رہے تھے۔

تقریر ختم کر کے ابوالکلام نے مولانا حالی سے کچھ کہنے کے بجائے ان کی طرف ایسی پر اعتماد نگاہوں سے دیکھا جن میں معانی کی اک دنیا چھپی ہوئی تھی۔

مخاطب بھی آخر حالی تھے، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے سب کے سامنے گلے سے لگایا اور بازو پکڑ کر چند لمحوں تک دیکھتے رہے، پھر اونچی آواز میں بے اختیار کہہ اٹھے:

''صاحب زادے! یقین تو آ گیا، لیکن حیرت نہیں گئی۔''

آئینہ ابوالکلام آزاد ر ۳۲ رجمیل مہدی کا صاحب کا مضمون

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ

مولانا عبدالباریؒ نے فرنگی محل کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی ہے کہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانہ میں ایک فرانسیسی تاجر مستامن کی حیثیت سے ہندوستان آیا، اس نے اپنی اقامت کے واسطے لکھنؤ میں ایک وسیع مکان تعمیر کرایا، جو حویلی فرنگی یا فرنگی محل کے نام سے مشہور ہو گیا، پھر جب اس تاجر کی قیام و امن کی مدت ختم ہو گئی تو وہ ہندوستان سے واپس چلا گیا اور یہ مکان اس زمانہ کے قانون کے مطابق نزولی جائداد کی حیثیت سے بیت المال میں شامل کر لیا گیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد ملا قطب الدین شہید کی اولاد نے ترک وطن کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہونے کا ارادہ کیا تو شہنشاہ عالمگیر نے یہ مکان ان کو عطا کر دیا، لیکن اس کا قدیم نام بدستور باقی رہا، یہ اصل وجہ تسمیہ ہے۔

اس کے بعد مولانا عبدالباریؒ نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ بعض افغانی طلبہ اور دیگر اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں فرہنگی تھا، جس کے معنی علم و دانش کے ہوتے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے: لیکن یہ توجیہ بہرحال اچھی اور اس مکان کے لائق ہے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی حیات و خدمات ر ۱۰ ۔ غلام مرسلین

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں

دیکھیے حدودِ حرم سے کچھ آگے نکل آئے، تلبیہ پڑھنے میں آنکھیں بھی زبان اشک سے لے میں لے ملا رہی ہیں، مکہ کے قریب میدان اور پہاڑ ویوں کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے ضرور گزرے ہوں گے، کیا عجب ہے کہ ان وادیوں میں بکریاں بھی چرائی ہوں، نہ جانے اس سرزمین کے کون کون سے قطعے ہیں جو حضور کے پاپوسی کے شرف کو اپنی جبینوں اور سینوں میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

مکہ کی آبادی آ گئی، رات کا وقت ہے، ایسے میں جو ٹیلہ، جو پہاڑی جو مکان بھی نظر آتا ہے، عقیدت کہتی ہے کہ اسے دل میں اتار لیجیے، یہ لندن اور پیرس نہیں یہ مکہ مکرمہ ہے، یہ بلد امین ہے، ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹوں نے اسی مقدس سرزمین پر کعبہ کی بنیادیں اٹھائی تھیں اور اس پاک اور مبارک شہر کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ انسانیت کے محسن اعظم، دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور نبیوں کے خاتم محمد عربی (فداہ ابی وامی) کا مولد ومنشاء ہے، زمانہ کی قدر ناشناسی اور دنیا کی غفلت کے ہاتھوں انسانی مجد وشرف کی تاریخ یا تو لوگوں نے بھلا دی تھی، یا پھر اسے مسخ کر دیا تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کا پہلا ورق اسی سرزمین پر مرتب ہوا، اسی سرزمین سے حق کی وہ آواز بلند ہوئی جس نے باطل کے جسم میں تھرتھری پیدا کر دی، یہ تاریخی شہر نہیں خود تاریخ ساز شہر ہے، اس شہر پر تاریخ کا ذرہ برابر احسان نہیں؛ بلکہ خود تاریخ پر اس شہر کا احسان ہے، تاریخ اس شہر سے جا کی پہچانی جاتی ہے، اگر تاریخ سے مکہ کو نکال دیا جائے، تو پھر تاریخ میں رہ کیا جائے گا۔

جلال وہیبت اور جبروت وابہت کا سامنا ہے، ایک عالم گومگو اور ایک کیفیت بے

نام ہے جو طاری ہوتی چلی جارہی ہے۔

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں
اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

کاروان حجاز/۳۶۔ ماہر القادری

حفیظ جالندھری کی ناراضگی

ایک بار حفیظ جالندھری پطرس بخاری سے ناراض ہو گئے، دوستوں کی ناراضگی پطرس سے دیکھی نہیں جاتی تھی، بے چین اور بے کل رہتے تھے، چنانچہ ایک دن کہنے لگے حفیظ ناراض ہے چلو اسے چل کر منائیں، چنانچہ میں اور پطرس حفیظ صاحب کے یہاں پہنچے۔

پطرس نے جاتے ہی کہا، حفیظ میری خطائیں معاف کر دو، میں آج معافی ہی مانگنے آیا ہوں، پطرس نے ہر ہر انداز سے چاہا کہ حفیظ کی ناراضی ختم ہو، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، مرحوم آزردہ ہو کر لوٹے۔

کوئی آٹھ دس دن ہوئے، حفیظ صاحب میرے دفتر آ نکلے، میں نے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا، فرمانے لگے تم نے جو سنا ہے ٹھیک ہے۔

آخر بات کیا تھی؟

"تمہیں کیا بتاؤں طفیل، بخاری میرا دوست تھا، جگری دوست، اس جیسا آدمی پاکستان نے پیدا ہی نہیں کیا، ذہانت اس پر ختم تھی، دوستانہ حقوق کی بجا آوری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھا، مگر ـــــ"

مگر کیا؟

"وہ کمبخت بعض ایسی شخصیتوں کی صلاحیتوں کا منکر تھا جو میرے نزدیک واجب

الاحترام تھیں"۔

جناب/۲۶ر۔سابق مدیر ماہنامہ نقوش محمد طفیل

شہاب نامہ کے خالق

"قدرت اللہ شہاب"

یہ غالباً ۱۹۵۰ء میں محکمہ نشر واشاعت میں سکریٹری تھے، میں نیازمندی کے شوق میں ان کے پاس پہنچا، کارڈ بھیجا، جواب ملا، انتظار کیجئے، انتظار کیا، تو بلاوا نہ آیا، آہستہ آہستہ خون کھولنے لگا، بالآخر یہ رقعہ لکھ کر چلا آیا۔

"یہ ناچیز، آپ ایسے لاٹ صاحب سے ملنے چلا آیا تھا، آپ کو فرصت نہیں مجھ میں مزید تاب انتظار نہیں"۔

کوئی پندرہ دن کے بعد یہ لاٹ صاحب خود میرے دفتر میں آنکلے اور آتے ہی جو بات کہی وہ یہ ہے"۔

میں آپ سے معذرت کرنے آیا ہوں؛ مگر میں اس دن مجبور تھا، ایک بڑی ہی ضروری میٹنگ ہو رہی تھی، جس میں خود متعلقہ وزیر صاحب بھی شامل تھے، اس لئے آپ کو فورا بلانا مشکل ہو گیا تھا۔

ان کی معذرت کے بعد، نہ صرف یہ کہ معاف کردینے کو جی چاہا؛ بلکہ الٹی ندامت ہوئی کہ اتنے عمدہ آدمی کے بارے میں، جو میں نے رائے قائم کرلی تھی وہ کس قدر غلط تھی۔

ایک بار ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا، اس نوکری کے میں تو بڑے ٹھاٹھ ہوں گے، فرمایا، قطعاً نہیں اور ایک دلچسپ قصہ سنایا۔

میں نے ایک مزارعہ کی درخواست پر پٹواری کو لکھ دیا کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہئے، جب میرا آرڈر لے کر مزارعہ پٹواری کے پاس پہنچا تو اس نے وہ درخواست ہی لے کر پھاڑ دی اور مجھے بھی دو چار سنا دی، اطلاع ملنے پر میں خود اس کے پاس گیا، اس سے کہا کہ جناب اس غریب کا کام کر دیجئے، مجھے بھی اس نے نہ جانچا، جب وہ الٹی باتیں مجھ سے بھی کرنے لگا تو میرے ساتھیوں میں سے ایک بول پڑا، یہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ہیں، لہٰذا ادب سے بات کرو، جہاں حالات ایسے ہوں وہاں آدمی بھلا ٹھاٹھ سے نوکری کر سکتا ہے؟''

''آخر آپ نے اس پٹواری کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

''بس ہنس کر چلا آیا تھا''

یہ تو ان کی انسان دوستی اور نرم دلی کا حال ہے۔

ان جیسے سادہ لوح، انسان دوست، بھولے بھالے، مخلص اور دیانت دار افسر میری آنکھوں نے کم دیکھے ہیں۔

جناب ۲۲/۶/۱۷۶۱ء سابق مدیر ماہنامہ نقوش۔ محمد طفیل

شورش کاشمیری کی جوہر شناس نگاہیں

۱۹۶۱ء میں ہفت روزہ ''چٹان'' کے کسی شمارے کے ٹائٹل پر شورش کاشمیری صاحب نے جالب بھائی کی تصویر اس عبارت کے ساتھ شائع کی تھی، ''جواں سال شاعر حبیب جالب جو اپنے ہم عصروں کی صفوں کو چیرتا ہوا بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور پھر اگلے ہی سال ۱۹۶۲ء میں شاعر حبیب جالب نے جنرل ایوب خان کے خود ساختہ آئین

کے خلاف پہلی آواز بلند کی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

یہ نظم کیا تھی ایک طوفان تھا کہ جس کے سامنے کوئی آمر، کوئی جابر ٹھہر ہی نہ سکا، اس نظم پر سب سے بہترین تبصرہ ۱۹۶۲ء کے دستور کے خالق اور ممتاز قانون داں منظور قادر صاحب کا ہے، مرحوم نے جب اس نظم کے بارے میں سنا تو فوراً اپنے دوست ملک غلام جیلانی صاحب کو بلوایا، جیلانی صاحب جب منظور قادر صاحب کے بنگلے پہنچے تو دیکھا، کہ وہ بڑی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے ہیں، جیلانی صاحب نے پوچھا۔

جناب خیریت تو ہے؟

منظور قادر بولے! ہمیں اپنا دستور اب چلتا دکھائی نہیں دے رہا: کیونکہ حبیب جالب جب لاکھوں کے مجمع میں اپنی نظم ''دستور'' پڑھتا ہے، تو اس کے ساتھ لاکھوں انسان بیک زبان ہو کر کہتے ہیں۔

''میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا''

حبیب جالب ۔ گھر کی گواہی / ۱۵۷ ۔ سعید پرویز

احسان دانش مرحوم

احسان، گیلانی پریس بک ڈپو میں ملازم تھے، ہسپتال روڈ پر یہ بک ڈپو تھا، ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا، کسی گاہک نے آکر پوچھا، آپ کے پاس پریم چند کی ناول ''غبن'' ہے؟ احسان نے کہا نہیں، وہ شخص چلا گیا، تو میں نے احسان سے کہا یہ کیا مسخرہ پن ہے؟ وہ سامنے دیکھیے، غبن کی کئی جلدیں رکھی ہیں، احسان نے کہا کہ اگر کتاب بیچ دیں تو پھر دکان میں کیا رہے گا، غرض اس طرح احسان دانش گیلانی بک چلاتے رہے، اس کے بعد انہوں نے یونیورسٹی روڈ پر، اپنی دکان کھول لی، ساتھ ہی آپ نے اپنی کتابیں بھی چھاپنا شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ اپنے کام کو فروغ دیتے چلے گئے۔

احسان اس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ بوریے پر میری آنکھ کھلی ہے، قالین پر دم نکلے گا، کسی نے سوال کیا، احسان صاحب بوریے اور قالین میں کیا فرق ہے؟ کہنے لگے بال کا''۔

میرے گزشتہ روز و شب/۳۹۔ جگن ناتھ آزاد

اب تک تو جس زمین پہ رہے آسماں رہے

مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سے اقتباس

آیئے ایک نظر تفکر اس منظر پر ڈال لیجئے، جو اس وقت آپ کو دعوت نظارہ دے رہا ہے، آپ میں بہت سی آنکھیں ایسی ہوں گی، جن کے سامنے بار ہا ارباب حکومت و دولت کی شان و شوکت نے جلوہ فروشیاں کی ہوں گی اور عجب نہیں کہ کچھ نظریں ایسی بھی ہوں گی، جو حکمرانوں کے درباروں کی ہیبت و جبروت کا نظارہ کر چکی ہو! لیکن آج آپ دیکھ رہے ہیں

کہ کشش ونظر فریبی کے ان تمام سامانوں اور جلووں میں سے کوئی ایک بات بھی یہاں نظر نہیں آتی، دولت کی شان وشوکت کا یہاں نام ونشان نہیں ہے، دنیوی حکومت وفرماں روائی کی نمود ونمائش سے یہاں کا گوشہ گوشہ خالی ہے، نہ زریں لباسوں کی آرائش ہے، نہ مسند نشینوں کی زیبائش، فقرائے علم کا مجمع ہے، بوریا نشینان حق کی مجلس ہے، نیازمندان صدق و بے نیازان دنیا کا جمگھٹا ہے، یہاں آپ کو اس دنیا کی شان وشوکت نہیں مل سکتی، جسے چھوڑ کر اس وقت آپ آرہے ہیں؛ البتہ اگر اقلیم حق اور شہرستان صدق وصفا کا جلوہ وجلال دیکھنا مطلوب ہو تو انہیں فقرائے علم کے پھٹے پرانے کپڑوں اور پرشکوہ صورتوں کے اندر ڈھونڈ سکتے ہیں، یہ ان لوگوں کا مجمع ہے جنہوں نے فقروفاقہ کو ہمیشہ اپنی دولت سمجھا، زہد وتقوی کو اپنی اقلیم استغناء کا تاج وتخت بنایا، بے نیازی وبے مرادی کے لازوال خزانوں پر ہمیشہ قانع رہے، اور عشق حق اور پرستاری علم کی بوریائے کہنہ پر بیٹھ کر دنیا اور دنیا کی ساری عظمتوں سے بے پروا رہے؛ لیکن بایں ہمہ جن کے کبر حق اور سطوت الٰہی کا یہ عالم رہا کہ شاہان عالم نے ان کے پھٹے پرانے دامنوں پر عقیدت واطاعت کی آنکھیں ملیں اور تاج وتخت اور حکومت کو ہمیشہ ان پائے استقامت کی ٹھوکریں ہی نصیب ہوئیں، انہوں نے اللہ کی چوکھٹ پر سرنیاز جھکا کر تمام کرہ ارضی کی عظمتوں اور رفعتوں کو اپنے سامنے سرنگوں کردیا۔

یہ سچ ہے کہ آج یہ خود اپنی ہی غفلت وخود فراموشی کی بدولت اپنی وہ رفعت وعظمت الٰہی کھو چکے ہیں اور اب ان کی عظمت وجلال کی حقیقت بھی تاریخ ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے، خدا نے ان کو جس منصب عظیم وجلیل پر سرفراز فرمایا تھا اس کی قدر انہوں نے نہ پہچانی اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے شرف عزت کا خلعت پارہ پارہ کردیا، خدا نے دنیا کو ان کے سامنے گرایا تھا؛ لیکن افسوس ہے کہ یہ خود دنیا کے سامنے گر گئے، خدا نے ان کو صرف اپنی

ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا؛ لیکن انہوں نے انسانوں کی چوکھٹوں پر جبہ سائی کی، جب اللہ اور اس کی کلمہ حق کی خدمت کی جانب سے ان کے دل غافل ہو گئے، تو دنیا نے بھی ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، بلا شبہ یہ حقیقت ہے؛ لیکن اے نظارگیان مجلس! خواہ زمانہ کے انقلابات وحوادث نے انہیں کتنا ہی حقیر و بے مروت بنا دیا ہو؛ لیکن خدارا، آپ انہیں چشم حقارت سے نہ دیکھیں، یہی ہیں، جنہوں نے اسی دنیا میں خدا کے رسولوں کی نیابت کی ہے، یہی ہیں، جو ان کے وراثت کے حقدار ٹھہرے ہیں، یہی ہیں، جن کے ہاتھوں میں امت مرحومہ اور خیر الامم کی قیادت وہدایت کی باگ رہی ہے، یہی ہیں، جو آج تیرہ سو برس سے خدا کی زمین پر اس کے کلمہ حق کی حفاظت کر رہے ہیں، یہی ہیں، جن کی عظمت لازوال کے نقوش صفحہ عالم پر ثبت ہیں اور جن کے ہیبت وسطوت کے افسانے آج تک زبان تاریخ پر جاری ہیں اور پھر یاد رکھئے کہ یہی ہیں، جو باوجود اپنی تمام کوتاہیوں اور درماندگیوں کے اب بھی آپکی قسمت کے مالک اور آپ کی سعادت وشقاوت کی باگ اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں، آپ کو اگر زندگی مل سکتی ہے، تو انہیں کے ہاتھوں سے اور اگر آپ اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، تو صرف انہی کی اطاعت وپیروی سے۔

خطبات آزاد ۸۰۔مولانا ابوالکلام آزادؒ

سید احمد شہیدؒ کی جماعت کا ایک فرد محمد امین امروہویؒ

جنگ آزادی کے نازک دور میں جب ایک تیز لفظ پر پھانسی دی جا سکتی تھی، حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت کا ایک فرد سید محمد امین صاحب امروہوی (م ۱۲۸۵ھ۔ ۱۸۶۸ء) کا یہ شعر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ان حالات میں ایک جرأت قلندرانہ؛ بلکہ اقدام سرفروشانہ سے کم نہیں، انگریز حوصلہ مندوں کے بارے جو ہندوستان پر تسلط حاصل

کرتے جارہے، وہ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں،

بہ نیروئے اسلامیاں زوردہ

بکہ شد از سگاں شہر ہا کوردہ

''مسلمانوں کے ہتھیاروں میں زوردے اس لئے کہ (مہذب وترقی یافتہ) شہر ان فرنگی کتوں کی وجہ سے گھٹیا دیہات اور''کوردہ''مقامات بن گئے ہیں''۔

اپنے فرزند کے لئے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مجاہد چنانش کن اندر غزا

کزو تا رسد بر نصاری سزا

اس کو ایسا مجاہد وغازی بنا کہ اس سے ان فرنگی عیسائیوں کو کچھ سبق ملے۔

تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ ر ۲۱۔ مولانا علی میاں ندویؒ

اے تیری قدرت! کہ مرگ عاشقی اچھی رہی

''مولانا عبید اللہ سندھیؒ''

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایک مشہور مجاہد آزادی اور مفکر تھے، ملک کی آزادی کے سلسلہ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، مولانا ایک سکھ خاندان کے چشم وچراغ تھے؛ لیکن اوائل عمر میں مسلمان ہو گئے اور حضرت شیخ الہندؒ کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے دیوبند آئے، دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ آپ کے استاذ رہے، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولنا شبیر احمد عثمانیؒ آپ کے مدرسہ کے ساتھی تھے، ایک خاص موقع پر ان کے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے جو اپنے زمانہ میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک مجاہدانہ تحریک کے علمبردار تھے، مولانا سندھیؒ کو واپس

دیوبند بلا لیا، مولانا سندھیؒ اپنے استاذ کے کاموں کے رازدار ٹھہرے، ریشمی خطوط کے سلسلہ میں ہندوستان سے نکلے اور آٹھ سال کابل میں رہے، وہاں سے نکلے روس اور ترکی پہنچے، ان دونوں ملکوں کے سیاسی انقلاب مولانا سندھی کی نگاہوں کے سامنے گزرے، آخر میں بارہ سال مولانا ممدوح نے مکہ مکرمہ میں گزارے اس طرح پچیس سال کی لمبی جلاوطنی کے بعد مولانا ہندوستان آئے۔

وفات کی خبر آئی کہ سندھ کے کسی گاؤں میں اس مرد مجاہد اور مشرق کے اس مفکر جلیل نے انتقال فرمایا، تو کئی دوست جمع تھے۔ ایک نے کہا کہ علم اور سیاسی فکر کا ایک ستون گر گیا، دوسرے نے کہا اسلامیات کے ایک زبردست عالم نے وفات پائی، تیسرے نے کہا ایک سخت جان اور جفاکش لیڈر کی موت، چوتھا بولا کہ ناکام ترین لیڈر اور مجھے یہ آخری بات پسند آئی، حقیقتاً مولانا ناکام ترین لیڈر رہتے، اپنے دوستوں کی خودغرضیاں، ہندوستانی قوم کی بے شعوری اور ناسمجھی، ۲۵ رسال کی طویل جلاوطنی اور اس مدت طویل میں ہزاروں میل کا پیدل سفر، کئی کئی وقت کا فاقہ اور قسم قسم کی تکلیفیں، پھر وطن واپس آکر یہاں کے فرقہ وارانہ شور اور شر میں اپنی منجھے اور سلجھے ہوئے فکر کی ناقدری، طبقہ علماء کا جمود و قدامت پسندی اور انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کی بے راہ روی، یہ مسلسل مصائب اگر اس شخص کے دماغ پر اثر نہ ڈالتے اور اسے بھی کسی صاف اور ہموار میدان میں کام کرنے کا موقع ملتا تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ آزادی میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا نام گاندھی جی، شری سبھاش چندر بوس، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا آزادؒ، سردار پٹیل اور راجندر پرساد کے ساتھ لکھا جاتا۔

مگر آج مولانا کو ان کے کارناموں کو، ان کی محنتوں اور ان کی مشقتوں کی صحیح تفصیل جاننے والا طبقہ بہت ہی محدود ہے، زیادہ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے زندگی میں بھی

مولانا کو دیوانہ، ملحد، پاگل کہا اور اب بھی اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

ایک دوست نے بتایا کہ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''مجھے تم پاگل کہو مگر میری بات سن لو، اگر تم نے میری بات بھی مان لی تو میری دیوانگی کی قیمت ادا ہو جائے گی''۔ اللہ اللہ عجیب لوگ تھے جو خود کو مٹا کر قوم کو بنا گئے۔

تھے بہت طعنے ہوس کے اہل دل کی زیست پر
اے تیری قدرت! کہ مرگ عاشقی اچھی رہی

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ، ۱۹ تا ۲۷۔ ابن الانور مولانا سید از ہر شاہ قیصر

جگن ناتھ آزاد

(۱)

ہر مشاعرے سے میں ہمیشہ یہ تاثر لے کر آیا کہ تقسیم کے باوجود کوئی نہ کوئی رشتہ مودت ایسا ہے جو ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ کیے ہوئے ہے، خدا جانے ان کا سبب وہ انسان دوستی ہے جس سے اردو کا خمیر اٹھا ہے یا پاکستان والوں کا وہ جذبہ مہمان نوازی ہے جس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم فرما گئے:

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

لیکن کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو اتنی تقسیم کے باوجود دلوں کو آپس میں ملائے ہوئے ہے۔

مدت کی بات ہے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مشاعرے میں شرکت کے بعد دہلی واپس آ رہا تھا، میرے دوست محمد طفیل مدیر نقوش نے مجھے رخصت کے وقت مٹھائی کا ڈبہ دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں تو ہم یوں رخصت کرتے ہیں جیسے بیٹی کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے۔

(۲)

میرے محبّ صادق میاں محمد شفیع ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں سے ملاقات کرنے دہلی آئے، انہیں اپنی مصروفیات سے کچھ وقت جو ملا تو میرے پاس بھی تشریف لائے، جب چلنے لگے تو میں نے کہا: شفیع صاحب یہ ملاقات بڑی مختصر رہی ہے، رات کو کھانا آپ غریب کھانے پر میرے ساتھ کھایئے، تاکہ کچھ دیر اور باتیں کرنے کا موقع ملے، کہنے لگے کھانا کھانے کی یا چائے پینے کی تو مجھے فرصت ہی نہیں ہے، لنچ مولانا آزادؒ کے وہاں ہے، چائے جواہر لال نہرو کے یہاں، ڈنر راجہ غضنفر علی کے یہاں، تم سے ملنے میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں میں لاہور ہی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، اسی طرح جس طرح راوی اور لارنس باغ لاہور کے حصے ہیں۔

میرے گزشتہ روز وشب/۵۵تا۵۷۔ جگن ناتھ آزاد

عجب چیز ہے لذت آشنائی

حنبلی مذہب کے ابن عقیل فحول علماء میں شمار ہوتے ہیں؛ بلکہ اپنی محققانہ کتابوں کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کا وجود سرمایہ ناز ہے، ابن الجوزی نے منتظم میں ان کے خودنوشت حالات نقل کئے ہیں، جو پڑھنے کے لائق ہیں، خود ان کا بیان ہے کہ بارہ سال کی عمر میں بالغ ہوا اور اس وقت اسی سال کا ہوں، لیکن اپنی فکری اور ذہنی قوتوں کو بلکہ بینائی، شنوائی وغیرہ حواس کسی میں کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کرتا، اس وقت بھی باریک سے باریک ہلال دیکھ لیتا ہوں؛ البتہ جوانی کی تروتازگی وشادابی باقی نہیں رہی ہے، وجہ اس کی یہ تھی کہ جیسا کہ خود لکھا ہے کہ ساری زندگی عفت وپارسائی کے ساتھ گزارنے کا موقع ان کو ملا، اپنے علمی شوق کو بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ آج اسی سال کی عمر میں مطالعہ اور

کتابوں کے پڑھنے کا شوق مجھ میں اس وقت سے زیادہ ہے جب بیس سال کا تھا، تقریباً بیاسی سال کی عمر پائی، آخر میں کہتے تھے کہ اچھا ہوا میرے سارے دوست میرے سامنے چلے گئے اب دنیا سے مجھے کچھ دلچسپی باقی نہ رہی۔ نزع کا حال طاری تھا، گھر کی عورتیں رونے لگیں، بولے چپ رہو، پچاس سال سے جس کی ملاقات کی آرزو میں تھا مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اس کا استقبال کروں اور خوش آمدید کہوں، لوگوں کا بیان ہے کہ تین لاکھ سے کم آدمی ان کے جنازے میں نہ تھے ۱۳۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۱۳ھ میں وفات پائی۔

مقالات احسانی ر ۷۸۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی

امام رازیؒ

(۱)

حضرت امام فخرالدین رازی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر کتاب لکھی ہے، ان کی تفسیر ''تفسیر کبیر'' خاص اہمیت رکھتی ہے۔

امام صاحب کا عہد اور سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ ایک ہی تھا، ایک مرتبہ برسرِ منبر وعظ کہتے ہوئے امام صاحب نے شہاب الدین سے کہا: ''اے بادشاہ نہ تیری سلطنت باقی رہے گی اور نہ رازی کا تملق ونفاق، ہم سب کو خدا کے پاس واپس جانا ہوگا'' راوی کا بیان ہے کہ شہاب الدین غوری دیر تک روتا رہا۔

(۲)

امام صاحب کا ایک دوسرا واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ آپ ہرات تشریف لے آئے تو ایک مردِ صالح سے ملاقات ہوئی، تو اس نے کہا آپ کا سرمایہ علم ہے؛ لیکن آپ نے خدا کی معرفت کیسے حاصل کی؟ امام صاحب نے فرمایا: سو دلیلوں سے، اس مردِ صالح نے کہا

کہ دلیل کی ضرورت شک کے زائل کرنے کے لئے ہوتی ہے؛ لیکن خدا نے میرے دل میں ایسی روشنی ڈال دی ہے کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں شک کا گذر ہی نہیں ہوسکتا، کہ مجھ کو دلیل کی ضرورت ہو، امام صاحب کے دل میں اس کلام نے اثر کیا اور اسی مجلس میں اس مردِ صالح کے ہاتھ پر توبہ کی، اور خلوت نشین ہوگئے، راوی کا کہنا ہے کہ یہ مرد صالح شیخ نجم الدین کبریٰ تھے۔

تعمیر حیات ۱۹۸۳ر شعبان

مولانا معراج الحق صاحب دیوبندیؒ

مفتی عبدالرؤوف غزنوی صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ملنے کے بعد جب احقر کو حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ سے پڑھنے، استفادہ کرنے اور ان کی خدمت میں موقع بہ موقع حاضر ہونے کا موقع ملا اور تعلقات میں مضبوطی پیدا ہوگئی تو ایک مرتبہ انہوں نے ہدیہ سے متعلق مندرجہ ذیل اپنا ایک واقعہ سنایا:

"ہندوستان کے مشہور شہر مدراس (موجودہ چینائی) سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے ایک مرتبہ دارالعلوم کی زیارت کی اور مجھ سے بھی ملے، اس دوران انہوں نے مجھے ہدیہ کے طور پر ایک چھڑی پیش کی، مذکورہ شخص کا چونکہ دارالعلوم سے کوئی رسمی تعلق نہیں تھا اور نہ کوئی اور ایسی علامت تھی جس سے اس ہدیہ میں کوئی شبہ پیدا ہوجاتا، لہٰذا میں نے شکریہ کے ساتھ ان کا ہدیہ قبول کیا اور ان کو رخصت کردیا، البتہ میرے پاس چونکہ اپنی چھڑی موجود تھی، اس لیے ان کی چھڑی حفاظت سے رکھی اور استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، تقریباً ایک سال گزرنے کے بعد وہ شخص پھر دارالعلوم آئے اور مجھ سے مل کر اپنے ایک رشتہ دار طالب علم سے متعلق بتایا کہ وہ دارالعلوم میں پڑھتا ہے اور امتحان میں اعلیٰ نمبرات

حاصل نہ کرنے کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام کے مطابق ایک عام کمرہ میں اس کو رہائش دی گئی ہے، جب کہ میری یہ تمنا ہے کہ اعلیٰ نمبرات والے طلبہ کے لیے مخصوص کمروں میں اس کو رہائش دی جائے، تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ پڑھ سکے، لہٰذا آپ اس کے لیے سفارش فرمادیں! میں نے اُٹھ کر اپنے کمرے کے ایک کونے میں حفاظت سے رکھی ہوئی ان کی مذکورہ چھڑی نکالی اور یہ کہہ کر واپس کردی کہ آپ کے اس ہدیہ ہی نے آپ کے اندر یہ جرأت پیدا کردی کہ مجھ سے دارالعلوم کے اُصول وقواعد کے برخلاف سفارش کرنے کی بلا تکلف فرمائش کی جس سے آپ کا یہ ہدیہ مشکوک ہوگیا، لہٰذا آپ اپنا ہدیہ واپس لے جائیں۔''

ماہنامہ بینات رصفر/۱۴۴۱

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

(۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ ان کے حجرے میں تین چاند ٹوٹ کر گرے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کا ذکر کیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی حجرے میں مدفون ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ان تین چاندوں میں سے ایک یہ ہے اور یہ ان میں سب سے بہتر ہے۔

بعد کے واقعات نے ثابت کردیا کہ دو پچھلے چاند صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اب بیوہ تھیں اور اسی عالم میں انہوں نے عمر کے چالیس مرحلے طے کئے، جب تک زندہ رہیں اسی مزار اقدس کی مجاور رہیں، قبر نبوی کے پاس کی سوتی تھیں، ایک دن آپ کو خواب میں دیکھا اس

دن سے وہاں سونا چھوڑ دیا۔

(۲)

تیرہ برس تک یعنی جب تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں مدفون نہیں ہوئے تھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بے حجاب وہاں آتی جاتی تھیں، کہ ایک شوہر تھا، دوسرا باپ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تدفین کے بعد فرماتی تھیں کہ اب وہاں بے پردہ جاتے حجاب آتا ہے۔

سیرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا/۱۳۲۔ سید سلیمان ندویؒ

صادقین صاحب

ہمارے ایک مشترکہ دوست نے کہا کہ نقوش والے محمد طفیل کے لئے آپ کی تین چار تصویریں چاہئیں، تو میں نے ان سے کہا: یہ بات ہے تو تین چار کیوں جتنی چاہیں لے لیں۔

باتوں باتوں میں، میں نے ان سے پوچھا تھا، آپ کو اپنی تصویر کا زیادہ سے زیادہ کیا معاوضہ ملا ہوگا؟ انہوں نے بتایا کہ میری تصویروں کی نمائشیں زیادہ تر غیر ممالک میں ہوئی ہیں، امریکہ، فرانس اور لندن کے متعدد شہروں میں: مگر وہ زمانہ میرا ابتدائی تھا، جب میرے فن کے صرف بال و پر نکل رہے تھے، اس پر مجھے فرانس میں ایک تصویر کے تین ہزار پونڈ ملے تھے اور میری تصویر کی جو کم سے کم قیمت پڑی وہ بھی چار سو پونڈ سے کم نہ تھی۔

"واہ، واہ!"

اصل واہ، واہ کی بات یہ ہے کہ مجھے جب بھی اور جو کچھ بھی ملا میں نے زیادہ تر مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا، روپیہ رکھنے کی چیز نہیں، بانٹنے کی چیز ہے، میں جیسے جیسے روپیہ بانٹتے گیا ویسے ویسے میرا فن امیر ہوتا گیا، اس اعتبار سے آج میں اتنا امیر ہوں کہ قارون

کے خزانے بھی پائے حقارت سے ٹھکرا سکتا ہوں۔

یہ خیالات ایک بہت ہی منحنی شخص کے ہیں، نازک و نزار شخص کے، جس کا وزن چند تولوں میں نہیں تو چند سیروں میں ہوگا؛ مگر جو اپنے خیالات کی اڑان میں اتنا عظیم الجثہ ہے کہ باید و شاید! جو اپنے خلوص میں اتنا بے پایاں ہے کہ بے مروتی منہ چھپائے پھرتی ہے، جو اتنا سادہ رہتا ہے کہ امارات کا ٹھسا بھی شرمسار ہے، جو اپنے آپ میں اتنا مست ہے کہ پاکستان کا دیو جانس کلبی بن گیا۔

معظم ۱۱۴ر۔ محمد طفیل، سابق مدیر ماہنامہ ''نقوش''

غالب کی شاعری اور صادقین صاحب کی مصوری

بھائی جب میں نے ''بیاض غالب'' میں آپ کی تصویریں چھاپی تھیں تو اس وقت چند ایک آوازیں ایسی بھی اٹھی تھیں کہ غالب کی شاعری میں قنوطیت کا عنصر سرے سے ہے ہی نہیں؛ مگر یہ تصویریں سراسر اسی کیفیت کا اظہار ہیں، ان کا جواب یہ تھا ''بات یہ ہے کہ جب غالب اس دنیا میں تھے اس وقت مسائل ایسے اور اتنے نہ تھے، شہنشاہیت کا دور تھا سب اچھا کہنے کا دور، پھر اس میں شخصی ویرانی اتنی نہ تھی؛ مگر میں نے یہ تصویریں اس دور میں بنائی ہیں، میں نے آج کے زمانے کی نمائندگی کی ہے، غالب کے اشعار کو اس کے ماحول مطابق دیکھنا چاہیے، پہلے اجتماعی شعور اتنا بیدار نہ تھا، جتنا کہ آج ہے؛ اگر میری تصویروں میں موجودہ دور کے انسان کی ناداریوں اور اس کی مجبوریوں کے ساتھ اس کی بے حالی اور بے کسی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا''۔

معظم ۱۱۹۔ محمد طفیل، سابق مدیر ماہنامہ ''نقوش''

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

صادقین صاحب

(۱)

اپنے فن کو کسی فرد کی ملکیت بنانے کے بجائے میں چاہتا ہوں کہ اسے وقف العوام بنایا جائے، میں نے غالب سے متعلق تصویریں غالب اکیڈمی کو دے دیں، بلا معاوضہ دے دی، میں اپنا سارا دوسرا کام بھی کسی عوامی ادارہ کو بلا معاوضہ ہی دے دوں گا، سوری لیسین لکھنے میں اپنی خواہش کا عمل دخل صرف اتنا ہے کہ میں چاہتا تھا کہ اسلامی گیلری میں ایرانی قالینوں، مغلیہ اگالدانوں اور ملکہ نور جہاں کے جھمکوں کے ساتھ کوئی فن پارہ ایسا بھی ہو جسے اسلام سے بھی کوئی نسبت ہو۔

(۲)

کہنے لگے کہ لاہور میوزیم کی چھت پر میری لکھی ہوئی جو قرآن کی آیات ہیں، میں انہیں اتروانا چاہتا ہوں،

کیوں؟

اگر کبھی اسی حالت میں ننگی تصویروں کی نمائش ہوئی تو میرا جذبہ ایمان مجروح ہوگا۔

(۳)

صادقین مجھ سے کہنے لگے میں اپنی تصویروں کی نمائش کر رہا ہوں، میں نے کہا: ایسے وقت جب کہ مشرقی پاکستان میں جنگ زوروں پر ہے، کہنے لگے: اگر کسی کو میرے فن

سے عشق ہوگا تو گولیوں کے بوچھاروں کے درمیان بھی ضرور پہنچے گا،ایسی صورت میں ایک آدمی بھی گھر نکل پڑا تو وہ ایک ہزار پر بھاری ہوگا، پھر دیکھا گیا کہ ایک آدمی نہیں سینکڑوں لوگ ان کی تصویروں کی نمائش میں پہنچے۔

اسی نمائش میں ایک صاحب نے اپنے پائپ سے دھنواں چھوڑتے ہوئے ان سے پوچھا تھا، جناب، یہ تو بتائیں کہ آپ کی تصویروں میں کٹے ہوئے سر کیوں نظر آتے ہیں؟۔

ان کا جواب تھا کہ، ایک غیور لیکن غریب آدمی اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے؛ لیکن آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔

وہ صاحب امیرانہ ہنسی ہنسے؛ مگر زبان سے یہ کہا ''ہمیں سمجھا دیجئے'' اس وقت مسکرائے تو صادقین صاحب بھی؛ مگر ان کی ہنسی کٹیلی تھی، پھر گویا ہوئے، پہلی بات تو یہ کہ کٹے ہوئے سر نہ کہیں؛ بلکہ یہ کہیں کہ سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں؟۔

''چلئے یہی سہی''

قصہ یہ ہے کہ اخلاقی جدوجہد میں بکھرے ہوئے تاروپود کو سمیٹنے کے سلسلے میں یعنی اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کے سلسلہ میں سر کو ہتھیلی پر ہی رکھنا ہوگا؛ ورنہ آپ مشن میں کامیاب نہ ہوں گے۔

وہ صاحب پھر گویا ہوئے'' آپ بہت بڑی بڑی تصویریں بناتے ہیں، میں نے آپ کا کوئی کام چھوٹا نہیں دیکھا''۔

نہ جانے پوچھنے والے کا مدعا کیا تھا؛مگر یہ ٹھٹھول آمیز منطقی جواب کے موڈ میں آ گئے، کہنے لگے:اگر لباس ڈھیلا ہو تو کاٹ کر موزوں کیا جا سکتا ہے؛لیکن اگر لباس جسم سے

چھوٹا ہوتو اس صورت میں جسم کی تراش خراش مشکل ہوگی۔

معظم/۱۳۲،۱۲۸۔محمد طفیل، سابق مدیر ماہنامہ "نقوش"

علامہ سیّد سلیمان ندویؒ

سلیمان کی وجہ تسمیہ اور ندوی نام کا جزء

(۱)

رکھنے کو تو روشن ضمیر دادا نے اپنے پوتے کا نام انیس الحسن رکھا اور بعد میں دنیا نے بھی دیکھا کہ حسن صلح جوئی، اس کا نمایاں خلق تھا، اسی طرح نسبی شرافت کے اعتبار سے ابو نجیب کی کنیت بھی ہر طرح کی موزوں تھی؛ مگر چشم قدرت کچھ اور دیکھ رہی تھی اور اس کے تقاضے کچھ اور ہی تھے، وہ ایک ایسا نام چاہتی تھی جو نو مولود کے آئندہ اوج وکمال کا ترجمان ہو، چنانچہ ایک ادنیٰ بہانے سے قدرت کا چاہا ہوا پورا ہوگیا۔

ہوا یہ کہ عین اسی زمانہ میں ایک رنگونی تاجر سلیمان ناخدا (جس نے کلکتہ کی مشہور مسجد ناخدا تعمیر کروائی تھی) کا ایک جہاز، بیرونی سامان تجارت سے لدا ہوا خلیج بنگال میں داخل ہوا اور اس کی آمد سے مشرقی ہندوستان میں ایک دھوم مچ گئی، گھر گھر ہر ایک کی زبان پر سلیمان کا نام آنے لگا، حکیم محمدیؒ (سید صاحب کے جد امجد) کے گھر میں بھی اس کا چرچا ہوا، گھر والوں نے محبت سے ابونجیب کو پکارا کہ ہمارا سلیمان تو یہ ہے اور ایک دن اس کا شہرہ بھی گھر گھر ہو جائے گا، پھر جب سلیمان شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا نام سید سلیمان رکھا۔

پھر دنیا کو ماننا پڑا کہ وہ سلیمان علم وعرفان تھے اور ان کے خزینہ علمی وعرفانی سے ملت اسلامیہ مالا مال ہوگئی۔

(۲)

مشیت الٰہی کو یوں منظور ہوا کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان پانچ سلیمان پیدا ہوئے اور ان پانچوں کو عزت وعظمت کے لئے چن لیا گیا، عمر کے تفاوت کے باوجود ایک ہی وقت میں سب کی شہرت عام ہوگئی، کوئی پختگی کی عمر کو پہنچ کر نمایاں ہوا تو کوئی نوعمری ہی میں چمک اٹھا، غرض آسمان شہرت پر آئے تو کہکشاں بن کر، مشہور واعظ وعالم اور صوفی شاہ سلیمان پھلواریؒ کو اولیت اور سید سلیمان دیسویؒ کو خاتمیت کا شرف ملا، درمیان میں قاضی سلیمان منصور پوریؒ مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا سلیمان اشرف بہاریؒ (سابق صدر شعبہ دینیات علی گڈھ یونیورسٹی) اور سر شاہ سلیمانؒ (وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی) آئے، اس اجتماع کی وجہ سے تخصیص اسمی کی غایت یعنی امتیاز وتعارف فوت ہوگئی تھی، ایک کا اسم گرامی سن کر دوسرے کی شخصیت کا ذہن میں آجانا بعید نہ تھا، حضرت والا نے اس ضرورت کے ماتحت اپنے نام کے ساتھ دیسوی کے لفظ کا اضافہ فرمایا، چنانچہ ابتداء میں جو مضامین ''معارف'' میں چھپے ہیں ان میں سید سلیمان دیسوی ہی لکھا ہے؛ لیکن یہ خاکی نسبت نہ تو سلیمان وقت کو زیب دیتی تھی نہ چل سکی، قدرت نے اس کو بہت جلد علمی نسبت سے بدل دیا، پھر دیسوی کے بجائے ندوی لکھنے لگے اور یہ نسبت اس قدر مقبول ہوئی اور نام کے ساتھ کچھ ایسا میل کھا گئی کہ خود نام کا جزء بن گئی، اب نام سید سلیمان نہیں رہا؛ بلکہ سید سلیمان ندوی ہوگیا۔

تذکرہ سلیمان ۳۱/۱، ۳۲۔ غلام محمد بی۔ اے۔ عثمانیہ

اقبال کے آخری لمحے!

محمد شفیع صاحب کے قلم سے انگریزی ہفتہ وار ڈان (دہلی) میں تلخیص واقتباس

اقبال کی موت ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو ۵/بجے صبح واقع ہوئی، عین وقت پر کل تین آدمی موجود تھے، ایک علی بخش قدیم خدمت گار، دوسرے دیوان علی، مالش کرنے والے، تیسرے یہ خاکسار، حالت چوبیس گھنٹے قبل سے ردی ہو چکی تھی اور سارا گھر تشویش میں مبتلا تھا، بجز خود حضرت اقبال کے، آج وہ کبھی اداس ہو جاتے اور کبھی چاق اور کبھی سوچ میں پڑ جاتے؛ لیکن ہمت وجرأت ہر حال میں رفیق تھی، نیند کا پتہ رات بھر نہ ملا، ایک بجے رات کو جب پشت میں درد زیادہ بڑھا، تو میں نے نیند لانے والی ڈاکٹری دوا پیش کی، بولے اسے تو ہرگز نہ پیوں گا، اس میں افیون کا جزء ہے، جان ہوش وحواس کے ساتھ دینا چاہتا ہوں، پانچ بجنے سے کل دس منٹ قبل فروٹ سالٹ کا پورا گلاس نوش فرمایا اور بس چند ہی منٹ بعد قلب کے مقام پر ہاتھ رکھ کر زور سے آہ کی، علی بخش نے مستعدی کے ساتھ اٹھ کر اپنی گود میں بٹھا لیا، اقبال نے کہا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے قلب میں خنجر بھونک دیا ہے۔

اس کے بعد اقبال نے اپنی آنکھیں کھول دیں، چھت کی طرف دیکھا اور زبان سے نکلا ''اللہ'' یہ آخری لفظ تھا، جو اس شاعر اسلام کی زبان سے نکلا، علی بخش نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اقبال کو پلنگ پر چت لٹا دیا، شاعر کا سر جوں ہی تکیہ پر پہنچا، کہ منہ قبلہ کی طرف پھر گیا، اب معاملہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا تھا، چند ہی منٹ میں روح قالب سے بالکل پرواز کر چکی تھی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

صبح وفات کی شام کو شاعر کی چھوٹی بچی بانو سلمہا کمرے میں باپ کے پاس آئی تھی، باپ کی بے نور آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جب وہ

چلی گئی تو ہم لوگوں سے کہا کہ دیکھو بچی کا دل خود بخود گواہی دے رہا ہے کہ اب وہ یتیم ہونے کو ہے، بعد مغرب زمانہ اسلامیہ کالج کی پرنسپل فاطمہ بیگم حاضر خدمت ہوئیں، اقبال دیر تک ان سے کہتے رہے، کہ مسلمان طالبات کو قرآن کا علم خوب حاصل کرنا چاہئے، ۱۱ ربجے شب کو جب تکلیف بڑھ گئی تھی، خادم قدیم علی بخش نے سامنے آ کر رونا شروع کر دیا، اقبال بولے "بے چارہ کیسے نہ روئے جانتا ہے کہ چالیس سال کی رفاقت ختم ہو رہی ہے"۔

آدھی رات کو دوست واحباب سب رخصت ہو گئے، اس کے بعد طبیعت بہت بگڑی، کچھ دیر بعد دیوان علی نے پنجابی میں بلھے شاہ کا کلام سنانا شروع کیا، اقبال پر رقت طاری ہو گئی، آنسو بہہ کر رخساروں پر آ گئے، ۳ ربجے حالت اور نازک ہوئی، میں سائیکل پر حکیم صاحب کو لینے گیا، وہاں سب سو رہے تھے، کسی نے میری آواز نہ سنی، مایوس لوٹا، چند منٹ بعد دیکھتا کیا ہوں کہ اقبال خود اپنی رباعی گنگنا رہے ہیں:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

۵ ربجے جسم وروح کی آخری کشمکش شروع ہوئی اور ختم ہوئی، آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور شاعر اسلام کا آفتاب زندگی غروب، خوف وہراس کا مطلق نام ونشان نہ تھا، آخری سانس جسم سے نکلی آخری لفظ لب پر "اللہ" تھا۔

صدق ۲ر مئی ۱۹۴۳ء

السیف اصدق ابناءً من الکتب

"تلوار نجومیوں سے زیادہ سچی خبر دینے والی ہے"

اے اخوان عزیز! یاد رکھئے دنیا میں امن و صلح، ترک قتل و غارت کا تصور کتنا ہی خوشنما ہو؛ مگر دنیا کہ بدقسمتی سے اب تک اصلی قوت تلوار کی قوت اور زندگی کا سرچشمہ آب حیات خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں ہے، دنیا میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا ہے کہ تلوار کی صداقت ضعیف ہوئی ہو اور امید نہیں کہ آئندہ بھی کبھی ایسا زمانہ نصیب ہو، غریب اخلاق نے ہمیشہ اپنے تنگ دامانی بیکسی میں چھپ کر ایسی دنیا کی متنیں مانی ہیں، جب کہ تمام کائنات انسانوں کی جگہ ملائکہ معصومین کی بہشت زار بن جائے گی اور قتل خون ریزی کو لوگ اس طرح بھول جائیں گے جس طرح موجودہ عالم نے امن اور صلح کو فراموش کر دیا ہے، اس آرزو کے حسن و جمال پر کون دل ہے جو فریفتہ نہیں ہوگا؛ لیکن کیا کیجئے کہ دنیا امید اور آرزو کی نہیں؛ بلکہ حقائق و نتائج کی جگہ ہے اور انسان جب تک فرشتہ نہیں؛ بلکہ انسان ہے اس وقت تک ایسی امیدوں کا اخلاق کے صفحوں سے باہر پتہ لگنا ممکن نہیں، آج اگر پوچھا جائے کہ قوموں کی زندگی اور زندگی کے مظاہر کہاں تلاش کئے جائیں تو اس کا جواب علم وفن کی بڑی درس گاہوں اور علوم الاولین والآخرین کے کتب خانوں سے نہیں ملے گا؛ بلکہ ان آہن پوش جہازوں کے مہیب طول وعرض سے، جن کی قطاریں ساحل کے طول میں پھیلی ہوئی اور جن کے روزنوں سے انسان پوش توپوں کے دہانے نکلے ہوئے ہیں۔

پس حضرات! وہ ہاتھ نہایت ہی مقدس ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو، مگر زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں خون چکاں تلوار کا قبضہ ہو، یہی اقوام کی زندگی کا منبع، قیام عدل و میزان کا وسیلہ، انسانی سبعیت و درندگی کا بچاؤ اور مظلوم کے ہاتھ میں اس کی حفاظت

کی ایک ہی ڈھال ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ.

اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان دی، تا کہ لوگ عدل اور انصاف پر قائم ہوں اور تیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی صورت میں سخت خطرناک بھی ہے اور نفع رساں بھی۔

اتحاد اسلامی/۱۶۔ابوالکلام آزادؒ

علامہ اقبال اور ڈاکٹر لوکس

ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوت شرکت دی، اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا، ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے، چائے پی کر چلے نہ جانا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے، ہم چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشہ میں لے گئے اور کہنے لگے:

"اقبال! مجھے بتاؤ، تمہارے پیغمبر پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی انہوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اس طرح اتری تھی"؟

میں نے کہا: "یہ عبارت ہی اتری تھی"

ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا: اقبال تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے، کہ یہ عبارت ہی اس طرح اتری ہے؟"

میں نے کہا: ڈاکٹر لوکس! میرا تجربہ یہ ہے، مجھ پر شعر پورا اترتا ہے، تو پیغمبر پر عبارت کیوں نہ اترتی۔

"جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے، مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھینچتی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے، سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں"۔

فن اور شخصیت، آپ بیتی نمبر/۳۶

ہیچ و پوچ اور جگر کی شاعری

سید بدرِ عالم بھی بابائے اردو کے ایک رتن تھے، ان کے خادمِ خاص، بابائے اردو کی طرح انھوں نے بھی گھر بار کا جنجال نہیں پالا تھا۔

خواجہ صاحب کے بہ قول ان کے دو شوق تھے، اخباروں سے فلم ایکٹریسوں کی تصویریں کاٹ کر ایک رجسٹر میں چپکانا اور اگر کوئی شخص گفتگو میں کوئی نیا لفظ استعمال کرے تو اسے یاد کر لینا اور اپنی گفتگو میں استعمال کرنا۔

ایک دن ان کی موجودگی میں کسی صاحب نے ہیچ و پوچ، کے الفاظ استعمال کیے۔

سید صاحب کو یہ الفاظ بڑے بھلے معلوم ہوئے اور انھوں نے یاد کر لیے، استعمال کے منتظر رہے۔

اتفاق یہ کہ دو تین دن کے بعد جگر صاحب انجمن آئے، کراچی آئے ہوئے تھے تو مولوی صاحب سے ملنے آ گئے۔

مولوی صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، جگر صاحب اطمینان سے بیٹھے تو شعر

خوانی کا آغاز ہوا، جگر صاحب کا لحن اور کلام کی رعنائی، سید صاحب مسحور ہو گئے، بے اختیار ہو کر بولے:

''ایسا ہیچ و پوچ کلام تو آج تک نہیں سنا۔''

جگر صاحب سناٹے میں آ گئے، مولوی صاحب نے ڈانٹا، ''کیا بکتا ہے۔''

مگر سید صاحب بھی اپنی وضع کے ایک ہی تھے، کہنے لگے، ''چاہے مار ڈالو؛ مگر کلام بڑا ہیچ و پوچ ہے۔''

مولوی صاحب نے چھڑی سنبھالی؛ مگر کچھ سوچ کر ٹھہر گئے، پوچھا، ''کچھ سمجھتا بھی ہے، کیا بک رہا ہے؟''

سید صاحب نے کہا، ''سمجھتا کیوں نہیں، بڑا اعلیٰ درجے کا کلام ہے۔''

مولوی صاحب ہنس پڑے، پوچھا، ''یہ الفاظ تجھے کس نے سکھائے؟''

سید صاحب نے بتایا فلاں صاحب اس دن آئے تھے، انھوں نے یہ الفاظ کہے تھے، مجھے اچھے لگے، میں نے یاد کر لیے۔

جگر صاحب یہ سُن کر مسکرائے اور سید صاحب کی گلوخلاصی ہوئی۔

(قومی زبان، مشفق خواجہ نمبر، ۵۵۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی تحریر سے اقتباس)

مولانا محمد علیؒ

(۱)

ایک بار محمد علی انگلستان میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے، وقت کل پانچ منٹ کا ملا، انہوں نے تمہید یوں اٹھائی، کہ میں چھ ہزار میل کے فاصلے سے تیس کروڑ آبادی کی نمائندگی کرنے آیا ہوں، اب آپ خود حساب لگائیے کہ ایک منٹ نہیں ایک ایک سیکنڈ؛ بلکہ ہر سیکنڈ

کی کسر میں مجھے کتنی ترجمانی کا وقت ملتا ہے، حاضرین لوٹ گئے اور آوازیں آنے لگیں کہ آپ کہے جایئے، آپ کہے جایئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا پانچ منٹ کی جگہ پورے بیس منٹ بولے۔

(۲)

سفر لندن میں کسی جگہ مولانا تقریر میں بیان یہ کررہے تھے کہ ہرلیس اور سمرنا تو چاہے حضور چھوڑ ہی دیں، قسطنطنیہ کس طرح چھوڑ سکتے ہیں، جس سے ہماری تمام قدیم ملی روایات وابستہ ہیں، جلسہ مخالفین سے بھرا ہوا تھا، انہیں میں سے ایک تاریخ کے فاضل نے کھٹ سے سوال کردیا کہ یہ تو بتایئے قسطنطنیہ کب سے آپ کے قبضہ میں ہے، کوئی معمولی مقرر ہوتا تو گھبرا جاتا، مولانا نے اپنے سلسلہ کلام میں ذرا فرق آنے دیئے بغیر جواب دیا: سنہ تو یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے قبضہ میں ہندوستان ہے اس سے تگنی مدت سے ہمارے قبضہ میں قسطنطنیہ ہے، جلسہ میں قہقہہ پڑا اور فاضل تاریخ مدھم پڑ گئے۔

(۳)

خلافت کمیٹی کے جلسوں میں گرما گرم نوک جھونک کے وقت بار بار یہ منظر دیکھنے میں آتا، ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس دہلی میں حکیم اجمل خان صاحب کے مکان پر ہورہا تھا، محمد علی بیمار معذور لیٹے ہوئے تھے، مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر ایک روزنامہ کے مالک، مع اپنے صاحبزادے کے، اور اسی روزنامہ کے ایڈیٹر بھی تشریف فرما تھے، بحث نے طول کھینچا، اور یہ تینوں صاحب ناخوش ہوکر جلسہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، محمد علی برکاتہ پکار اٹھے، غضب ہوگیا، باپ، بیٹے، روح القدس تینوں خفا ہوگئے۔

کیا خوب آدمی تھا/۱۱۳

پردہ نشین خاتون کی گاڑی

جس گاڑی کو پٹنہ اسٹیشن پر صبح کے چھ بجے پہنچنا تھا، وہ ایک بجے دوپہر کو اسٹیشن پہنچ رہی تھی، نماز ظہر سے ریل ہی پر فراغت کر لی گئی تھی، اے ڈی سی صاحب مع کار کے آئے تو معذرت کرتے ہوئے؛ حالانکہ معذرت سرتاسر غیر ضروری تھی، کار روانہ ہوئی اور منٹوں کے اندر گورنمنٹ ہاؤس کی برساتی کے اندر تھی؛ لیکن یہ کار باوجود اعلیٰ درجہ کے ہونے کے نکلی کچھ عجیب سی، بیٹھتے ہی نظر اس پر پڑی کہ ہر طرف کچھ بندی ہے یعنی اس کے شیشوں پر سامنے اور پیچھے اور بازوؤں پر ریشمی پردے کچھ اس طرح پڑے ہوئے ہیں کہ ہٹانے سے بھی پوری طرح نہیں ہٹتے، یہ کیا ماجرا ہے؟ اے ڈی سی صاحب نے معمہ یوں حل کر دیا کہ گاڑی خود لاٹ صاحب کی نہیں: بلکہ ان کی بیگم صاحبہ کی سواری کی ہے!۔۔۔۔۔ یہ کیا؟ اس بیسویں صدی میں اور اتنا سخت پردہ اور اتنے سخت پردہ کا اہتمام رکھنے والی کون؟ ایک گورنر کی بیگم! جب کہ دنیا جہاں کے گورنروں ہی کی بیگمات تو بے پردگی اور بے حجابی کا ریکارڈ قائم کر رہی ہیں، جہاں پشتینی پردہ نشینوں کی بے پردگی اور کہاں یہ گاڑی جو دوسروں کو پردہ نشین بنا دے، دل اس عالی ہمت خاتون کی اسلامیت پر عش عش کر اٹھا۔

سیاحت ماجدی/۱۳۳۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ظلم عظیم

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندانی قبرستان مہندیان میں ستر اسی برس کے ایک صاحب رہتے ہیں، ان کا اسم گرامی بھی عبدالعزیز ہے، بہت سیدھے سادے، بھولے بھالے اور نیک آدمی ہیں، مگر زبان اور طرز گفتگو کرخنداری ہے، مولانا (منصور

غم راشد الخیری) کی اور عبدالعزیز کی بڑی مزیدار باتیں ہوا کرتی تھیں، یہ مولانا کو جہاں مل جاتے، وہیں مولانا ان سے گھل مل کر باتیں شروع کر دیتے، ایک دفعہ کی باتیں سنیئے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی سترہویں تھی، مولانا فیض بازار کی پٹری پر کھڑے سترہویں میں جانے والوں کے تانگوں اور موٹروں کا تماشا دیکھ رہے تھے، کہ عبدالعزیز صاحب تشریف لے آئے، مولانا نے پوچھا: کہاں سے؟ عبدالعزیز صاحب بولے، میاں سلطان جی سے چلا آتا ہوں، میاں وہاں مُن برس رہا ہے مُن، مولانا نے فرمایا: عبدالعزیز تمہیں رشک آتا ہے تو تو بھی پیری مریدی کرنے لگو، عبدالعزیز بولے، میاں ہمیں رشک کاہے کو آنے لگا، مولوی صاحب! تم نے تو قرآن پڑھا ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، بندے سارے گناہ معاف کر دوں گا، ایک سے لے کر ہزار گناہ کر کے آجا، کوئی مضائقہ نہیں؛ لیکن اگر تو نے شرک کیا تو سمجھ لے بخشوں گا نہیں۔

کیا خوب آدمی تھا/۱۱۔ ملا واحدی

مصورغم علامہ راشد الخیری مرحوم

(۱)

تئیس چوبیس سال سے مولانا کی اکثر میرے یہاں نشست رہتی تھی اور مولانا کے آخری دور کے ہم تین ساتھی تھے، میں، خواجہ فضل احمد خان صاحب شیدا اور عارف ہسوی، ہم چاروں قریب قریب روز ملتے تھے اور دن میں کئی دفعہ ملتے تھے، میں اپنے چاروں دوستوں کی جماعت میں نسبتاً خشک تھا، اس واسطے بے تکلفی مولانا کی حقیقتاً خواجہ فضل احمد صاحب اور عارف ہسوی سے تھی، خصوصاً خواجہ فضل احمد صاحب سے؛ لیکن مولانا چوکتے مجھ سے بھی نہیں تھے اور میں بھی انکی مہربانیوں کے سبب اتنا گستاخ ہوگیا تھا کہ ”شام

زندگی" لکھنے کا جب فیصلہ ہوا تو مولانا مہینوں اڑان گھائیاں دیا کیے، مولانا لکھتے تھے؛ مگر مجبور ہوئے بغیر قلم ہاتھ میں نہیں پکڑتے تھے، بہت کیف لکھتے تھے، زبردستی سے اور لکھتے تھے تو صرف دس منٹ سے گیارہواں منٹ لکھنے پر صرف نہیں کرتے تھے، دس منٹ لکھا اور باہر آگئے، میرے یہاں تشریف لے آئے، کسی تانگہ والے کے پاس جا کھڑے ہوئے، کسی دکان دار سے باتیں کرنے لگے، اور پھر جا کر لکھنا شروع کر دیا اور پھر دس منٹ کے بعد کرسی کاٹنے لگی، یہی سلسلہ تمام دن جاری رہتا تھا، میں نے "شام زندگی" لکھنے کے فیصلے میں رخنہ پڑتے دیکھا تو ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں میز کرسی بچھوادی اور مولانا آئے تو ان سے کہا، "چلو کوٹھری میں" اور ان کے کوٹھری میں گھستے ہی کنڈی لگادی اور سنادیا، چاہے لکھو چاہے نہ لکھو، کنڈی دو گھنٹہ سے پہلے نہیں کھلے گی، مولانا عارف اس سازش میں شریک تھے، مولانا ایک دفعہ عارف صاحب سے فرمایا: ارے! "تجھے خدا کانگریس کی محبت اس لیے دی ہے کہ تو بار بار جیل جائے اور میرے جس بیجا کا بدلہ اترے، اچھا ہے یہیں بھگت لے، ورنہ خدا کے یہاں بیڑیں کھانی پڑیں گی"۔

(۲)

عارف صاحب کا انتقال مولانا کے انتقال سے چند روز پہلے ہوا تھا، عارف صاحب کے انتقال کی خبر مولانا کو نہیں ہونے دی تھی، عارف صاحب مولانا کو پوچھتے پوچھتے مر گئے اور مولانا عارف صاحب کو مرتے مرتے پوچھا کیے، آخری دنوں میں کسی نے مولانا سے کہہ دیا کہ عارف اب اچھے ہیں، مولانا نے فرمایا: کیوں مجھے بناتے ہو، وہ بھلا بچنے والا تھا، وہ جا چکا لیکن ایک آدھ کو اس کے پیچھے پیچھے ضرور جانا پڑے گا، اکیلے اس کا دل تھوڑا ہی لگ سکتا ہے، انتقال سے چار روز پہلے شہنشاہ جارج پنجم کی رحلت کا کوئی صاحب ذکر کر

رہے تھے، ایک بزرگ بولے کیوں جی، اب بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا، مولانا کی نقاہت کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں دلچسپ سوال سن کر بے اختیار آنکھیں کھول دیں، اور زبان پر برجستہ یہ فقرہ آیا، ''نہیں جناب کے حق میں وصیت کر گئے ہیں''۔

کیا خوب آدمی تھا رے۔ ملا واحدی

مسلمان؟

جب میں مسجد کے سامنے سے گزرتا ہوں تو میری رفتار خود بخود سست پڑ جاتی ہے، گویا کوئی میرا دامن پکڑ رہا ہو، میرے قدم وہیں رک جانا چاہتے ہیں، گویا وہاں میری روح کے لیے تسکین کا سامان موجود ہو، مجھ پر ایک بے خودی سی طاری ہونے لگتی ہے؛ گویا مسجد کے اندر سے کوئی میری روح کو پیامِ مستی دے رہا ہو، جب موذن کی زبان سے میں اللہ اکبر نعرہ سنتا ہوں تو میرے دل میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو جاتا ہے؛ گویا کسی خاموش سمندر کو متلاطم کر دیا گیا ہو، جب نمازیوں کو میں خدائے قدوس کے سامنے سربسجود دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں ایک بیداری سی پیدا ہوتی ہو جاتی ہے؛ گویا میری روح کو ایک متوحش خواب سے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا ہو۔

لیکن جب مسجد سے چند قدم آگے بڑھ جاتا ہوں تو پھر:

میری آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کا نقشہ آتا ہے، رنگ کس قدر پھیکا، خطوط کس قدر غیر مناسب، حدود کس قدر غلط، برتن کس قدر تنگ۔

میں سوچنے لگتا ہوں:

یہ مسلمان جو صرف اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں کہ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھ چھوڑتے ہیں۔

یہ مسلمان جو صرف اس لیے مسلمان کہلاتے ہیں کہ ان کی پیدائش مسلمان گھرانوں میں ہوتی ہے۔

یہ مسلمان جن کی گفتار میں فضائل اسلام کا ذکر پایا جاتا ہے؛ مگر جن کے کردار میں اسلام کی روح نہیں دیکھی جاتی۔

یہ مسلمان جو فقط صورت اور نام کے مسلمان ہیں؛ مگر سیرت اور کام کے مسلمان نہیں۔

یہ مسلمان جن کا جسم تو مسلمان ہے؛ مگر جن کے دلوں کا خدا ہی حافظ ہے، خود ان کے پاس ہے ہی کیا جو مجھے ان کی صحبت و قرابت سے کچھ مل سکے گا، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ میرا ظاہر کافر کہلاتے ہوئے بھی میرا باطن مسلمان رہے، بجائے اس کے کہ میرا ظاہر مسلمان کہلاتے ہوئے بھی میرا دل ان مسلمانوں کے دل کی طرح کافر ہی رہے؟

اگر محض مسجد کی نمازیں، کعبہ کا حج اور قرآن کی تلاوتیں ہی کسی کو فرشتہ بنا سکتیں تو یہ کہلانے والے مسلمان کبھی کے فرشتے بن چکے ہوتے۔

مذہب کا تعلق جبہ و دستار اور ریش دراز سے نہیں؛ بلکہ انسان کے دل سے ہے، پھر اگر میرا دل مسلمان ہے تو میرے جسم کے مسلمان نہ ہونے پر کسی کو اعتراض کیوں ہو۔

بہت ممکن ہے:۔

کہ "سچے" مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد میرے اس "کفر" پر ناک بھوں چڑھائے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میرے اس "کفر" میں ان کے کہلانے والے اسلام سے کہیں زیادہ حقانیت موجود ہے۔

سیرت محمدی ﷺ پر ایک ہندو ادیب کی کتاب "عرب کا چاند" سے اقتباس

ابوالبرکات بغدادی کا شوق علم

ابوالبرکات بغدادی ایک نامور طبیب ہونے کے ساتھ ایک مشہور فلسفی بھی ہے، اس کی تعلیم کا آغاز ایک عجیب طریقے سے ہوا، جس سے اس کے شوق علم اور ذہانت وطباعی دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

اس زمانے میں ابوالحسن سعید بن ہبۃ اللہ بن الحسین ایک مشہور طبیب تھا اور طلباء کی ایک جماعت روزانہ اس سے طبی تعلیم حاصل کرتی تھی، ابوالبرکات بغدادی بھی اس سے تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کی؛ لیکن چونکہ ابوالبرکات بغدادی یہودی تھا اور ابوالحسن یہودیوں کو تعلیم نہیں دیتا تھا، اس لئے اس کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی، مجبوراً اس نے اس کے دربان کی خدمت گزاری کا عار گوارا کیا اور اس حیلے سے اس کی ڈیوڑھی میں ایک ایسے مقام پر بیٹھ جاتا تھا، جہاں سے تمام اسباق ومباحث کو سن لیتا تھا، اس نے تقریباً ایک سال اسی حالت میں گزارے، اس کے باپ سعید بن ہبۃ اللہ کی مجلس درس میں ایک قابل بحث مسئلہ پیش ہوا اور اس کے تمام تلامذہ اس کو حل نہ کر سکے، ابو البرکات بغدادی موقع پا کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: اگر اجازت ہو تو میں بھی اس مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کروں، اس نے اجازت دی، تو اس نے جالینوس کے کلام سے اس کو حل کیا اور کہا کہ فلاں مہینہ، فلاں دن اور فلاں وقت میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی تھی اور اسی وقت سے یہ مسئلہ مجھے یاد رہ گیا، سعید بن ہبۃ اللہ کو اس کی ذہانت اور شوق پر تعجب ہوا اور اس سے دریافت کیا کہ تم کہاں بیٹھتے ہو؟ ابوالبرکات بغدادی نے بیٹھنے کی جگہ بتائی تو اس نے کہا کہ جس شخص کی یہ حالت ہو ہم اس کو علم سے محروم نہیں رکھ سکتے، اس وقت سے اس کو مقربین میں داخل کرلیا۔

نوٹ: ابوالبرکات بغدادی کے قبول اسلام کا واقعہ حکمائے اسلام صفحہ نمبر ۲۴۲ پر پڑھ سکتے ہیں۔

حکمائے اسلام، ۲۲۹۔ مولانا عبدالسلام ندوی

مبارک رخصتی

عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اس دنیا سے الوداع کہنے والے ہیں، عقیدت مندوں کا ایک ہجوم انہیں رخصت کرنے آیا ہے؛ لیکن شاید انہیں یہ پسند نہیں ہے، اسی لئے تمام لوگ ان کے کمرے سے باہر نکل رہے ہیں؛ لیکن شوق واشتیاق نے ان کے قدم روک لئے اور وہ سب کے سب دروازہ سے کان لگا کر بیٹھ گئے۔

ابھی انہیں بیٹھے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ کمرہ میں کسی کے بولنے کی آواز سنائی پڑی، توجہ کرنے پر پتہ چلا کہ عمر بن عبدالعزیز کی آواز ہے اور انہیں کے منہ سے اس قسم کے الفاظ نکل رہے ہیں۔

''خوش آمدید! اے آنے والو! تمہارا آنا مبارک ہو، میں تم کو دیکھنے کا بہت دنوں سے مشتاق تھا، لیکن تم جن اور انس کسی سے بھی مشابہ نہیں ہو، بہر حال کچھ بھی ہو آؤ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اور تمہارا منتظر ہوں، اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی۔

تلک الدار الآخرۃ الخ. اور خاموش ہوگئے، دروازے کے باہر سے سرگوشیاں ہوئیں اور لوگ کمرہ کی طرف دوڑ پڑے، اندر جاتے ہی سب پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔

تعمیر حیات، بحوالہ تاریخ الخلفاء، ۲۳۵/۱

غالب کے ایک شعر کی تشریح

وفاداری، انسانیت کی عظیم ترین خوبی ہے، وفاداری میں جو جتنا کامل ہوگا اتنا ہی وہ بلند انسان ہوگا، مقصد بلند ہو اور آدمی اس مقصد بلند کا وفادار ہو، یہ کمال کا فرد اعلیٰ ہے، اللہ کا وفادار ہو، رسول کا وفادار ہو، یہ انسانیت اور ایمان کی معراج ہے، آدمی نے کسی سے کوئی وعدہ کیا، کسی سے قول وقرار کیا، اس میں پکا ثابت ہوا، اس میں وفاداری کا نقشہ جمایا، یہ آدمیت اور اخلاق کی بلند ترین منزل ہے، یہ تو بڑی چیزیں ہیں، آدمی تو کسی گھٹیا مقصد کا عہد کرتا ہے اور اس کی پاسداری اور وفاداری میں جان دیتا ہے، تو بطور عبرت کے وہ بھی تعریف کا مستحق ہوتا ہے اور اسے لوگ اس کی بلندی میں شمار کرتے ہیں، مرزا غالب دیکھو کیا کیا کہتے ہیں۔

وفاداری بشرط استواری، اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

وفاداری، پختگی کے ساتھ ہو، اس میں کوئی تزلزل نہ ہو، اس کے خلاف کا وسوسہ نہ ہو، وفاداری پر جما تو جما، اس سے ذرا بھی انحراف نہ کیا تو سمجھو کہ ایمان کی اصل اسے حاصل ہے، اصل ایمان یہی ہے کہ وہ پختہ وفادار ہو، دیکھو برہمن نے بت پرستی کا عہد باندھا ہے، تو اگرچہ کفر ہے؛ لیکن اس نے کفر کے ساتھ اتنی وفاداری کی، کہ بت خانے میں بتوں کے قدموں پر جان دیدی، تو اب یہ اس کا مستحق ہے کہ دنیا کی مقدس ترین جگہ، جو مرکز ایمان ہے یعنی خانہ کعبہ، اسے وہاں دفن کیا جائے، کیونکہ اس نے اصل ایمان کو نباہ دیا ہے۔

مدارس اسلامیہ مشورے اور گزارشیں/۲۱۹۔ مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر

(۱) وہ قوم جو اپنے خالق کے سامنے قولا تو نہیں؛ لیکن عملا اور پابندی سے سر عبادت خم کرنے میں بھی بے پرواہی کرے۔

(۲) وہ قوم جو تیس روز تک اپنے مولا کے حضور حاضری دینے کے بعد اکتیسویں دن اس کے دربار سے منحرف ہو جائے۔

(۳) وہ قوم جو غیر یقینی رزق کی آواز پر تو صبح کاذب ہی سے جاگ اٹھے؛ لیکن رزاق کی طرف سے حی علی الفلاح کی آواز پر بیدار نہ ہو۔

(۴) وہ قوم جو نماز میں تو ایاک نستعین کہے؛ لیکن سلام پھیرے ہی، استادہ ہو کر غیر اللہ سے استعانت کرے۔

(۵) وہ قوم جو اپنے نبی کی لائی ہوئی امانت عظمی جو مخلوق تک پہنچانے میں سراسر غفلت کرے۔

(۶) وہ قوم جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا، ایک کافر بڑھیا کا سامان اٹھانے کا واقعہ تو بیان کرے؛ لیکن وہ خود مسلمان آفت زدوں میں پہنچ کر حرف تسلی نہ کہہ سکیں۔

(۷) وہ قوم جس کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ اس کی بدزبانی سے بے دین بھی شرما جائیں۔

(۸) وہ قوم جس کے چہرے، لباس اور نہ ہی دین کی اور تہذیب کی نمائندگی کریں۔

(۹) وہ قوم جو جوشیلی تقریروں پر تو نعرے بلند کرے؛ لیکن جوش کی باتوں پر کان نہ دھرے۔

(۱۰) وہ قوم جو اپنی مدد آپ کا مطلب صرف نفس کے تقاضوں کے سمجھے ملت کے مفاد کو نہیں۔

(۱۱) وہ قوم جس کی جیب قوالیوں اور مشاعروں وغیرہ کے لئے تو قہقہہ لگائے اور امت کے محتاجوں اور فلاحی اغراض کے لیے مشکل سے مسکرائے۔

(۱۲) وہ قوم جس کے پیر و جوان کسی حال میں بھی لہو لعب (سینما بینی) کو ترک نہ کریں۔

(۱۳) وہ قوم جس کے ایک مصیبت کے سیلاب زدہ طبقہ میں تو مٹی کا چراغ بھی نہ ہو اور اس کے مکانوں اور دکانوں میں رنگ و نور کا سیلاب ہو۔

(۱۴) وہ جس کی بے سہارا بیٹیاں تو لال جوڑوں اور پیلے رنگوں کے ایک ایک رقعہ پر دو دو روپے صرف کرے۔

(۱۵) وہ قوم جس کی مائیں بے حجابی کو خواہ مخواہ اختیار کرنے لگیں۔

اس قوم کو کیا اختیار پہنچتا ہو گا کہ وہ آواز بلند کرے۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر

اور بنیاد ہی کیا ہے اغیار سے شکایت کرنے کی، کہ ہم سے الفت کا معاملہ کرے۔

تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

کلید کامیابی تو صرف ایک ہے۔

"ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا"۔

رسول جو تم کو دیں، اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں تک جاؤ۔

پندرہ روزہ تعمیر حیات

علامہ شبلیؒ کی تیسری برسی

۱۸رنومبر کی صبح آفتاب ہر سال ۳۶۰ر بار طلوع اور غروب ہوتا ہے؛ لیکن جب ۱۸رنومبر کی صبح آتی ہے تو چرخ نیلگوں ایک اور طبق خونین کو اچھالتا ہے۔ جس کی طرف ناسخ نے مدتوں پہلے اشارہ کر دیا تھا۔

مرا سینہ ہے مطلع آفتاب داغ ہجران کا

مولانا کی وفات کے دن دار المصنفین کا دفتر اور اسکا تمام کاروبار بند ہو جاتا ہے اور دوپہر کو رسم فاتحہ خوانی کی جاتی ہے، اس دفعہ بھی حسب معمول دار المصنفین بند ہوا اور وقت پر قرآن خوانی کی گئی، رسم فاتحہ کے بعد قاضی محمد عبد الرحمان صاحب حیرت نے خاص مولانا مرحوم کے لہجے میں اپنا لکھا ہوا مرثیہ پڑھا، حافظہ نے نقش تخیل باندھا تو خود مولانا مرحوم کو سامنے کھڑا پایا حاضرین بے حد متاثر ہوئے، دردمندوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے استاد مرحوم نے کہا تھا۔

لب راز تبسم نتوانست نگہ داشت
وقتے کہ زجاں دادن شبلی خبر آمد

اگر واقعتا موجود ہوتے تو دیکھتے کی لب تبسم سے نہیں؛ بلکہ آہ وفریاد سے باز نہ رہ سکے اور باوجود اسکے کہ اس زخم کو تین برس دو مہینے گزر چکے ہیں؛ لیکن اب تک وہ بھرا نہیں ہے، تسکین ہے تو اس سے ہے کہ گو وہ زندہ نہیں؛ لیکن ان کا نام زندہ ہے اور خدا نے ان کے اس دعوے کو جھوٹا کیا۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ زخواہد بود☆ زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ ام

ماہنامہ معارف

مسافر اسلام
ہندوستان کے غربت کدے میں

صحیح حدیث میں ہے کہ اسلام کا آغاز مسافرانہ بے کسی میں ہوا اور پھر وہ مسافرانہ بے کسی میں ہوگا، تو مسافرت کے بے کسوں کو مبارکباد ہو، اسلام کا آغاز اس وقت ہوا جب حق کی آواز بند ہو چکی تھی، دین ابراہیم کا وجود سایہ ہو کر رہ گیا تھا، کفر و شرک کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، نبوت کا نور صدیوں سے زیر نقاب تھا، توحید کی دعوت ایک بیگانہ آواز تھی، جو مسافرانہ بے کسی کے عالم میں محمد بن عبداللہ کی زبان مبارک سے بلند ہوئی، پورب، پچھم، دائیں، بائیں ہر طرف اس صدائے حق کو اجنبی اور نامانوس سمجھا گیا، آواز دینے والے نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور ہر طرف اس کو وہی بیگانگی، اجنبیت، مسافرانہ بے کسی کا منظر نظر آیا۔

رفتہ رفتہ اجنبیت دور ہوئی، بیگانگی کافور ہوئی، آواز کی کشش اور نوائے حق کی بانسری نے دلوں میں اثر کیا، کان سننے لگے اور جو سننے لگے سر دھننے لگے، یہاں تک کہ وہ دن آیا سارا عرب اس کیف سے معمور اور شراب سے مخمور ہو گیا اور اسلام کا مسافر اپنے گھر پہنچ کر، اپنے عزیزوں اور دوستوں میں ٹھہر گیا۔

اب وہ قافلہ بن کر آگے چلا، عرب کے ریگستانوں سے نکل کر، عراق کے نہروں اور شام کے گلستانوں میں پہنچا، پھر آگے بڑھا اور ایران کے مرغزاروں اور مصر کے وادیوں میں آکر ٹھہرا، اس سے آگے بڑھا تو ایک طرف خراسان و ترکستان ہو کر ہندوستان کے پہاڑوں اور ساحلوں پر اس کا جلوہ نظر آیا، تو دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں کو طے کر کے

اس کا نور بحر ظلمات کے کنارے چمکا۔

اب آہستہ آہستہ قافلہ کے لوگ چھٹنے لگے، تماشائی تماشا کرتے ہوئے دور نکل گئے، کتنے حسن ظاہر کے طلبگار اور طبعی مناظر کے شیفتہ ان تماشوں میں اپنے سفر کے مقصد کو بھول گئے اور جہاں پہنچ گئے وہیں رہ گئے۔

اب وہ مسافر پھر تنہا تھا، اس کی آواز میں پھر بیگانگی آگئی، صدائے حق صدا بصحرا ہوگئی، آخر قافلہ کی بانگ دراں خاموش ہوگئی اور کاروان یکسر خواب غفلت میں محو ہوگیا۔

اس غفلت کی نیند پر چار سو برس گذر گئے اور مسافر کے آغاز سفر پر ہزاروں برس گزر رہا تھا، یہ اکبر کا دور تھا، جب عجم کے جادوگر نے، بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کے ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی، اب وقت ہے ایک شہنشاہ امی کے ذریعے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا دین منسوخ ہوکر، دین الٰہی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدے گرمادیے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے، برہمنوں نے بت آراستہ کیے اور جوگ اور تصوف نے ملکر کعبہ اور بت خانے کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا، اس بیچ تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر پر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو ''دبستان مذاہب'' کا مطالعہ کرے، کتنے زناروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلے میں زنار نظر آئیں گے، بادشاہی آستانے پر کتنے امیروں کے سر سجدے میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے اور سجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دینے لگی، تعالیٰ شانہ اللہ اکبر اس کی شان بلند ہے اللہ اکبر۔

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے پکارنے والے کی آواز آئی، راستہ صاف کرو، راستے کا چلنے والا آتا ہے، ایک فاروقی مجدد، فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد

سرہندی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جہانگیر کے طوق سلاسل نے بڑھ کر ان کے قدم لئے اور وہ شاہی قیدی کی حیثیت سے اسیر زنداں ہوئے، اس یوسف زندانی نے بھی یوسف کنعانی کی طرح ''ارباب متفرقون خیر ام للہ الواحد القہار '' کا نعرہ لگایا، اس نعرے نے سوتوں کو جگا دیا، مسافر اسلام کی دھیمی دھیمی آواز پھر سنائی دینے لگی۔

سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول ر ۷۔ (تحریر: سید سلیمان ندویؒ) حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

قرآن کریم پر محنت

مولانا آزاد رحمہ اللہ علیہ کو آیات قرآنی پر اتنا عبور اور اس قدر استحضار اور قرآن کریم کے گہرے معارف وحقائق کا اتنا علم وعرفان کس طرح حاصل ہوا؟

مولانا نے الفاتحہ کے مقدمہ میں اس کی خود وضاحت فرمائی۔ لکھتے ہیں:

کامل ۲۷ ربرس سے قرآن میرے شب وروز کے فکر ونظر کا موضوع رہا ہے، اس کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں، تفاسیر وکتب کا جتنا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث ومقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو، میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی وسعادت کے لیے سرچشمہ حیات، حقیقت قرآنی کا انبعاث ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے فہم وبصیرت کا دروازہ ان پر کھل جائے''۔

ترجمان القرآن رجلد اول ر ۷۵۔۷۶

ابوالکلام آزاد کی قرآنی خدمات ر ۸۷۔ افضل حق قرشی

علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

بروایت زعیم احرار سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا:

"میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کا امت مسلمہ میں وجود ہے: اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے"۔ (حیات انور)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت کی وفات پر جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا:

"مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین ابن دقیق العیدؒ اور سلطان العلماء شیخ عزالدین ابن عبد السلامؒ کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ہاں دیکھا ہے، کیوں کہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے؛ ورنہ اگر حضرت علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجرؒ، شیخ تقی الدینؒ اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہوا ہے"۔ (حیات انور)

حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری قدس سرہ فرمایا کرتے تھے:

"واقعی حضرت شاہ صاحب آیۃ من آیات اللہ تھے"۔

زعیم احرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایک دفعہ ڈابھیل تشریف لے گئے جامعہ اسلامیہ کے طلباء نے تقریر کی درخواست کی اور یہ بھی چاہا کہ حضرت علامہؒ کے حالات پر تبصرہ کریں، تو بخاری صاحبؒ نے فرمایا کہ:

"میرے جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کر سکتا ہے، صرف اتنا کہہ سکتا ہوں

کہ صحابہ کرام کا قافلہ جارہا تھا یہ پیچھے رہ گئے تھے"۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حضرت علامہؒ کے جلسہ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی؛ لیکن تبحر علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم نقلیہ و عقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا"۔

حضرت مفتی کفایت اللہؒ نے حضرت علامہؒ کے انتقال پر ایک مضمون میں تحریر فرمایا کہ:

آہ! قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا العلامۃ الفاضل الکامل، اکمل العلماء، افضل الفضلاء، الحبر یر المقدام، البحر الطمطام، رحمۃ العصر، قدوۃ الدہر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہابذہ، محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر علوم النقلیہ والعقلیہ، مولانا انور شاہ قدس سرہ کو آغوش رحمت میں کھینچ لیا ہے اور ظاہری طور پر ہمیشہ کے لئے جدا کردیا، حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے، جن کا نظیر مستقبل میں متوقع نہیں، طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل، ورع وتقویٰ وجامعیت، استغناء مسلم تھا، مخالف وموافق ان کے سامنے تسلیم وانقیاد سے سر جھکاتا تھا"۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحب مرحوم کے سانحہ ارتحال پر "معارف" میں کس قدر بلیغ بات کہی ہے۔

"مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے، جس کی سطح ساکن ہو؛ لیکن گہرائی موتیوں سے لبریز ہو"۔

علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب، ذہن ثاقب جمع کر دیا ہے اور شیخ الہندؒ حضرت شاہ صاحبؒ کو علامہ جیسے وقیع لفظ سے یاد فرماتے اور مسائل علمیہ میں جب کوئی دقیقہ سامنے آتا تو حضرت شاہ صاحبؒ سے دریافت فرماتے، کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے، علامہ صاحبؒ جواب دیتے اور حضرت شیخ الہندؒ مسرت و اطمینان کا اظہار فرماتے، استاد کا شاگرد کو علامہ سے یاد کرنا، حضرت علامہؒ کے کمال علمی پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ علی مصری حنبلیؒ حافظ حدیث مصر سے سوات آئے، وہاں سے دہلی اور دہلی سے دیوبند آئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درس بخاری شریف میں حاضر ہوئے، حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہؒ کی رعایت کرتے ہوئے بلیغ عربی میں تقریر فرمائی، علامہؒ نے سوالات کئے، ادھر سے جوابات دیئے گئے، درس ختم ہوا تو علامہ نے سینکڑوں طلبہ کے ہجوم میں فرمایا:

"میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء و اکابر سے ملاقات کی ہے، خود مصر میں سالہا سال درس حدیث دے آیا ہوں، میں نے شام سے لے کر ہند تک اس شان کو کوئی محدث اور عالم نہیں پایا، میں نے ان کو ساکت کرنے کی ہر طرح وشش کی؛ لیکن ان کے استحضار، تیقظ حفظ و اتقان، ذکاوت و ذہانت اور وسعت نظر سے میں حیران رہ گیا اور آخر میں کہا: لو حلفت انه اعلم بابی حنیفة لما حنثت یعنی اگر میں قسم کھاؤں کہ یہ ابو حنیفہؒ کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں تو میں اس دعویٰ میں جھوٹا نہ ہوں گا"۔

ہندوستانی علماء کو اعجام قرار دینے والے علامہ علی مصریؒ کا یہ اعتراف اور تاثر حضرت شاہ صاحبؒ کی شان علمی، جامعیت اور تبحر کی ایک مضبوط شہادت ہے اور علامہ علی

مصریؒ کا یہ اقرار اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ علم کسی کی میراث نہیں، علم اپنے محل کے اعتبار سے عربی وعجمی کی قید سے بے نیاز ہے۔

علامہ زاہد الکوثریؒ جیسی محیر العقول شخصیت سے اہل علم میں سے کون ناواقف ہوگا، علامہ ترکی کی ایک زبردست علمی شخصیت اور اس قحط الرجال کے زمانہ میں ایک نادر حیثیت کے مالک تھے، قاہرہ میں جلاوطنی کے ایام گزار رہے تھے، حضرت شاہ صاحب مرحوم کی بعض تصانیف وتالیفات کا مطالعہ کیا تو فرمایا کہ:

''احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحبؒ فتح القدیر کے بعد ایسا محدث وعالم امت میں نہیں گزرا اور یہ کوئی کم زمانہ نہیں ہے''۔

ترکی کے ایک دوسرے عالم سابق شیخ الاسلام جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے، انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے رسالہ ''مرقات الطارم'' کا مطالعہ کیا تو فرمایا:

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے''۔

علامہ اقبال مرحوم نے لاہور کے اس تعزیتی جلسے میں جو حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ہوا تھا تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

''اسلام کی ادھر پانچ سوسالہ تاریخ شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے''۔

علامہ اقبالؒ اور علامہ کوثریؒ کے رائے کا توافق وتوارد کس قدر حیرت انگیز ہے۔

خدام الدین لاہور، علامہ بنوری نمبر ۴۰ر۔۴۱ر حافظ عبدالرشید ارشد

ایمان کا سودا

ذکر قرون اولیٰ کا نہیں، قرون اخریٰ کا نہیں، زمانہ ہجرت کی پہلی صدی کا نہیں، تیرہویں صدی کا ہے اور انیسویں صدی عیسوی کا، مقام حجاز کے ارض مقدس کا نہیں، لکھنؤ بدعت زدہ لکھنؤ کی سرزمین ہے، دینی اور روحانی ہی نہیں، دنیوی اور مادی اقتدار بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے رخصت ہو چکا ہے اور وہ جو اودھ کی ایک بڑے نام کی، اسلامی سلطنت گذشتہ عظمت و اقبال کی نوحہ خواں، بچی کھچی، کٹی پٹی باقی رہ گئی تھی وہ بھی صاحب کے قبضہ میں جا چکی ہے۔

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

زمانہ ۱۸۹۲ء کا ہے، یعنی تاریخ اودھ کے مشہور ہنگامہ ۱۸۸۷ء کو فرو ہوئے ابھی پانچ ہی چھ سال ہوئے ہیں، ہر دل میں اقبال فرنگ کا نقش بیٹھا ہوا، ہر زبان سرکار عظمت مدار کی عظمت کا کلمہ پڑھتی ہوئی، فرنگی محل کے ایک گوشہ میں فقر و فاقہ کے ایک بوریے پر ایک صاحب بیٹھے نظر آرہے ہیں، نام محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر، کسی زمانہ میں عالم صاحب افتاء تھے، ہنگامہ میں گھربار کچھ اس طرح لٹا کہ مفتی صاحب زر و مال سے ہر طرح فارغ البال ہو گئے، دل میں داعیہ حج کا تھا وقت وہ آگیا کہ نہ حج فرض رہا نہ زکوۃ، اب صبر و تسلیم کی منزلیں ہیں اور یہ خانہ نشیں، گوشہ گزیں مولانا۔

ایک روز کیا ہوتا ہے ایک صاحب بہادر حکومت انگریزی کے بہت بڑے صاحب اختیار عہدہ دار صوبہ کے فائنشل جوڈیشنل کمشنر (اس وقت اودھ کے چیف کمشنر کے بعد سب سے بڑا عہدے دار یہی تھا) پتہ پوچھتے پوچھتے فرنگی محل پہنچتے ہیں اور بعد اجازت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، بعد اجازت، کا لفظ یاد رکھئے پرانے وقت کا یہ

مولوی ملّا نا ملازمت کی تلاش میں نہیں نکلتا، عہدہ ومنصب خود اسے تلاش کرتا ہوا اس تک پہنچتا ہے اور پھٹے حالوں مولانا جب تک اجازت نہیں دے لیتے انگریز بہادر کی ہمت سامنے آنے کی نہیں ہوتی۔

روایت ساری کی ساری ایک چشم دید راوی، فرنگی محل ہی کے خاندان کے ایک نوجوان کی دیکھی ہوئی اور بڑھاپے میں بیان کی ہوئی اور راوی بھی کون؟ کوئی گمنام مجہول نہیں، مولوی شرافت اللہ مرحوم پنشنر ڈپٹی کلکٹر، ابھی تو ان کے دیکھنے والے اور ملنے والے سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، انہوں نے اپنے صاحبزادے مفتی عنایت اللہ مرحوم (صدر مدرسہ عالیہ نظامیہ) سے بیان کیا اور انہوں نے اپنے تذکرہ علماء فرنگی محل" ص ر ۲۰۷ تا ۲۰۹" میں اسے درج کر دیا، ان کی وفات تو ابھی کل کی بات ہے۔

سامنا، صاحب کا ہوا، وقت وہ تھا کہ انگریز کا بچہ بچہ حاکم وقت تھا اور پھر یہ انگریز تو واقعی صوبہ کا تقریبا سب سے بڑا افسر تھا، شکستہ حال، غربت زدہ مولوی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھا ہوا کچھ لکھنے میں مشغول تھا، کہاں ڈرائنگ روم اور کہاں کے کوچ اور صوفے، حاکم وقت، حاکم صوبہ کو اجازت ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھنے کی ملی، آنے والے نے کچھ سوالات کئے شریعت کے معاملات قانونی (نکاح وطلاق) سے متعلق، جوابات مفصل ملے، اب سوال ہوا کہ جناب کی بسر اوقات کی کیا صورت ہے؟ جواب ملا کہ اسباب ظاہری تو کچھ نہیں، بسر عسرت سے ہوتی ہے۔

فاقہ زدہ مولوی نوکری پر نہیں گر رہا ہے، سندیں اور درخواستیں نہیں پیش کر رہا، سفارشوں کے پشتارے پیٹھ پر نہیں اٹھائے ہوئے ہے، نوکری خود اس خوددار مولوی پر گر رہی ہے، سوال وجواب آگے سنئے۔

''تو میں آپ کو سرکاری ملازمت دلوادوں گا''

''لیکن میں نے تو مدتوں فتوے احکام شریعت کے دیئے ہیں، خدا سے شرم آتی ہے کہ اب احکام خلاف شرع صادر کروں، انگریز کی ملازمت میں یہ ہونا لازمی ہے''۔

انگریز افسر نوکری دینے اور عہدہ بخشنے ہی آیا تھا، رخصت ہوا، چلتے چلاتے یہ الفاظ کہتا ہوا۔

''جی نہیں، آپ کے لئے ایسا انتظام کردیا جائے گا کہ نہ آپ کو احکام صادر کرنا پڑیں اور نہ کوئی امر خلاف شریعت آپ سے متعلق کیا جائے گا''۔

دوسری صبح کا سورج طلوع ہوا، تو انگریز افسر پھر موجود اور آج ایک مسلمان منشی بھی ہمراہ، مفتی فرنگی محل کے لئے عہدہ رجسٹراری کا تجویز ہوا، اس رجسٹراری کو آج کی سب رجسٹراری پر قیاس نہ کیجئے گا، شروع انگیریزی عہد میں ایک معزز ترین عہدہ تھا، کہیں، یہ خدمت کلکٹر سے لے لی جاتی اور کہیں ڈسٹرک جج سے، مشاہرہ، چھ سات سو ماہوار سے بھی اوپر تھا، رقم کا خیال فرمایا آپ نے؟ دس بیس پچاس نہیں کہ وہ بھی ایک ملائے مسجد کے لئے بہت تھے؛ بلکہ چھ سات سو اور وہ بھی اس زمانے کے، گو آج کی شرح کے تناسب سے کوئی ڈھائی ہزار کا مشاہرہ (ہمارے اس زمانے میں ۲۰۱۷ء کی شرح تناسب کے لحاظ سے قریبا ۲۵-۳۰ ہزار الفرقان)

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اور یہ تو آگ لانے کے لئے اپنی جگہ سے ہلے تک نہ تھے، جاہ و دولت کی پیمبری خود ہی چل کر ان کے پاس آگئی تھی، ملائے مسجد اب بھی فرط مسرت سے بے خود نہیں ہو جاتا، صاحب کے قدموں سے لپٹ نہیں جاتا، مدح و توصیف کے قصیدے نذر گزارنے کی فکر نہیں کرتا، سکون و وقار کے ساتھ پوچھتا ہے کہ یہ رجسٹراری ہے کیا چیز؟ صاحب سمجھاتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ

''آپ کو زحمت کچھ بھی نہ ہوگی، نہ کہیں آنا جانا، نہ کاغذات کا لکھنا پڑھنا، آپ کی کچہری آپ کے مکان میں رہے گی، ایک کمرہ ان منشی کو دے دیجئے، یہ اپنا کام کرتے رہیں گے، چار بجے کاغذات آپ کے سامنے پیش کر دیا کریں گے، آپ کا کام صرف دستخط کر دینا ہوگا، ایسی بے مشقت نوکری آج تک کسی کو کیوں ملی ہوگی۔

فرنگی محل کی فرنگی ملازمت کا پہلا دن شروع ہوا، منشی نے دن میں کام کیا، سہ پہر کو کاغذات مفتی صاحب کے پاس دستخط کے لئے پیش کئے، آپ نے دستاویزوں کو پڑھنا چاہا، منشی نے کہا کہ اس زحمت کی کیا ضرورت ہے، کاغذات میرے دیکھے ہوئے جانچے ہوئے ہیں، آپ صرف دستخط فرما دیجئے، ارشاد ہوا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے؟ دستخط تو بمنزلہ میری شہادت کے ہیں، بغیر پڑھے شہادت کیسے دے دوں؟ رجسٹر کھولا اور آپ نے کاغذات پڑھنے شروع کئے، اتفاق دیکھئے پہلی ہی دستاویز سودی قرضے سے متعلق تھی! آگے کیا گذری، خود راوی ہی زبانی سنئے:

''چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا، رجسٹر اٹھا کر دور پھینک دیا، منشی سے کہا ابھی نکلو'' اور فوراً نکال دیا۔

منشی غریب روتا ہوا اور فریاد لے کے صاحب کے پاس پہونچا، دوسرے دن صاحب خود وارد ہوئے، منشی کو ساتھ لئے ہوئے، اب پھر روایت کے الفاظ راوی ہی سے سنئے:

''آپ نے صورت دیکھتے ہی اس کو بھی ڈانٹنا شروع کیا اور فرمایا کہ کافر سے سوا اس کے اور کیا امید ہو سکتی ہے، میری ہی غلطی تھی جو کافر کے کہنے میں آگیا اور زار و قطار رونا شروع کیا''۔

پھر فرمایا:

''سودی دستاویز پر میرے دستخط کرا رہا تھا، جو گویا میری شہادت ہے، حدیث شریف میں سود کے متعلق لکھنے والے اور گواہ سب پر لعنت آئی ہے، ابھی تھوڑے زمانے تک تو میرے دستخط خدا اور رسول کے احکام پر ہوتے تھے اور اب میرے دستخط سودی دستاویز پر ہوں گے''۔

انگریز حاکم نے ایک بار پھر معافی مانگی، تلافی کر دینا چاہی اور کہا کہ بے شک مجھ سے غلطی ہوئی اب میں ایسی صورت رکھوں گا کہ یہ بھی زحمت نہ رہے اور امر خلاف شریعت کی صورت نہ پیش آئے گا اور عہدہ پر برقرار رہنے پر بے حد اصرار کیا؛ لیکن جو زبان ایک بار انکار پر کھل چکی تھی پھر کسی ترغیب اور کسی ترکیب سے نہ پلٹی اور آپ عمر بھر فرنگیت کے سایہ سے بچے رہے۔

عمر کا بڑا حصہ سلم و شرح معلم، ملا حسن، شمس بازغہ، طبعیات شفا وغیرہ، معقولات کی حاشیہ نویسی میں گزارا تھا، شاید اسی تقویٰ و استقامت ایمانی کی برکت تھی کہ چند سال بعد جب مدرسہ جونپور سے تعلق کے بعد نوبت حج کے جانے کی آئی تو ماہ رمضان مبارک مکہ معظمہ میں گزار کر عین قرب حج میں وفات مدینہ منورہ میں پائی اور جنت البقیع میں صدہا ہزار ہا پاکوں اور پاکبازوں کے جوار میں جگہ پائی اور فرنگی محل کے مشہور معروف عالم و عارف مولانا عبدالحیؒ نے اپنے قلم سے یہ شہادت اپنی ناتمام ''قاموس الفقہ'' میں دی کہ

كان جامعا للفروع والاصول حاويا للمعقول والمنقول صاحب الرياضات والمجاهدات منبع البركت الفيوضات حسن الصورة.

الفرقان انتخاب نمبر ۱۵ ۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ